LIBRARY
NOV
3
1976
UNIVERSITY OF TORONTO

روزہ مرا ایمان ہے ۔ غالبؔ ۔ لیکن	خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

دیگر

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے	بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار	فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

ہوں شاد نہ کیوں سائل و عالی باہم — ہے اکی شب قدر و دیوالی باہم

دیگر

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے — تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ — ہے صفر، کہ افزائشِ اعداد کرے

دیگر

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا — اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں — ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

دیگر

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں — عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا — کیونکر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں

دیگر

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے — کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے۔ اللہ اللہ — وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

دیگر

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں — آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں

دیگر

آتشبازی ہے جیسے شغلِ اطفال[له]
ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال

دیگر

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا
اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
غالب منہ بند ہو گیا ہے گویا

دیگر

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
دل رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

دیگر

بھیجی ہے جو مجھکو شاہِ جمجاہ نے دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

دیگر

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم

له یہ رباعیاں مروجہ دیواں سے نقل کی گئی ہیں۔ قلمی نسخہ میں ان کا کوئی شعر موجود نہیں پایا جاتا

دیگر

سامانِ ہزار جستجو یعنی دل
ساغر کشِ خونِ آرزو یعنی دل
پشت و رخِ آئینہ ہے دین و دنیا
منظور ہے دو جہاں سے تو یعنی دل

دیگر

اے کاش بتاں کا خنجرِ سینہ شگاف
پہلوے حیات سے گزر جاتا صاف
اک تسمہ لگا رہا کہ تا روزے چند
رہیے نہ مشقتِ گدائی سے معاف

دیگر

اے کثرتِ فہم بے شمار اندیشہ
ہے اصلِ خرد سے شرمسار اندیشہ
یک قطرۂ خون و دعوتِ صد نشتر
یک وہم و عبادتِ ہزار اندیشہ

دیگر

دل سوزِ جنوں سے جلوہ منظر ہے آج
نیرنگِ زمانہ فتنہ پرور ہے آج
یک تارِ نفس میں جوں طنابِ صناغ
ہر پارۂ دل برنگِ دیگر ہے آج

دیگر

گر جوہرِ امتیاز ہوتا ہم میں
رسوا کرتے نہ آپ کو عالم میں
ہیں نام و نگیں کمینگہِ نقبِ شعور
یہ چور پڑا ہے خانۂ خاتم میں

دیگر

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی	م	بیتابیِ رشک وحسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن اے تجلی افسوس		تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

دیگر

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے	م	وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
مغرور و فنا ہو کہ جوں کاغذ باد		
یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد		ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

دیگر

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل	م	سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش		گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

دیگر

ہر چند کہ دوستی میں کامل ہونا		ممکن نہیں یک زبان و یکدل ہونا
میں تجھ سے اور مجھ سے تو پوشیدہ		ہے مفت نگاہ کا مقابل ہونا

قطعہ

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

رباعیات

بعد از اتمام بزم عید اطفال
م ایام جوانی رہے ساغر کش حال
آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم
اے عمرِ گزشتہ یک قدم استقبال

دیگر

شب زلف و رخِ عرق فشاں کا غم تھا
م کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک چشم چشم نم تھا
ہر قطرۂ اشک۔ دیدۂ پر نم تھا

گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزشِ داغہائے پنہاں کا

گاہ رو کر کہا کیے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

قطعہ تاریخ

خجستہ انجمنِ طوے میرزا جعفر
(بیاہ)
کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ

ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب
نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی محظوظ
۱۰۳۴

دیگر

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید

کہا غالب سے تاریخ اس کی کیا ہے
تو بولا "انشراحِ جشنِ جمشید"
۱۲

قطعہ

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

قطعہ

بسکہ فعال ما یرید ہے آج[۱]
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا

[۱] یہ قطعہ اردوئے معلیٰ کے ص ۳۰۳ و ۳۰۹ سے یہاں نقل کیا ہے۔ مطبوعہ دیوانوں میں نہیں پایا جاتا

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوے خوش گفتار

رزم کی داستاں اگر سنیے
ہے زباں میری تیغِ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میری ابرِ گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

خانہ زاد اور مرید اور مداح	تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر	نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں؟	مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد۔ اگرچہ مجھکو نہیں	ذوقِ آرائشِ سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر	تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش	جسم رکھتا ہوں۔ ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال	کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ	بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انسان	دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی	وَقِنا ربنا عذابَ النار
میری تنخواہ جو مقرر ہے	اُس کے ملنے کا ہے عجیب ہنجار
رسم ہے مُردہ کی چھ ماہی ایک	خَلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھکو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات	اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض	اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا	ہو گیا ہے شریک ساہوکار

قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

گزارشِ مصنف بحضورِ شاہ

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار
تم نے مجھکو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز
روشناسِ ثوابت و سیار
گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
بادشہ کا غلامِ کارگزار

ہے داغ غلامی ترا توقیعِ امارت

قطعہ

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت
ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت
ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر
قاصر ہے شکایت میں تری میری عبارت
نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت
تجھکو شرفِ مہرِ جہاں تاب مبارک
غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بیشمار چاند
غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند

در مدحِ شاہ

اے شاہِ جہانگیر جہاں بخشِ جہاندار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اُس عقدہ کو۔ سو بھی بہ اشارت
ممکن ہے۔ کرے خضر سکندر سے ترا ذکر؟
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت
آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت
ہے نقشِ مریدی ترا فرمانِ الٰہی

نسبت اک گونہ مرے دلکو ترے ہات سے ہے

ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں

یہ دعا شام و سحر قاضیِ حاجات سے ہے

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا

گو شرف خضر کی بھی مجھکو ملاقات سے ہے

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار

غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

متفرقات

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو

رکھدیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند

جو آئے جام بھر کے پیے اور ہو کے مست

سبزے کو روندتا پھرے پھولونکو جائے پھاند

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں

ہے جنکے آگے سیم و زرِ مہر و ماہ ماند

سہرا لکھا گیا زرہ امتثال امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ۔ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مدح

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا۔ کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے۔ تو کس بات سے ہے

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونق بزم مہ و مہر تری ذات سے ہے

اور میں وہ ہوں کہ گرجی میں کبھی غور کروں
غیر کیا۔ خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سر دست

کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار

لائیگا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

گزارش

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں۔ اور مرا مسلک ہے صلحِ کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب۔ یہ مجال۔ یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا — جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
مجھکو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیے ہونگے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہربار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کی برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک

کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے
کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے

کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجے
کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے

کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ لکھیے
کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلمیٰ کہیے

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

قطعہ

نہ پوچھ اسکی حقیقت حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی

نہ کھاتے گیہوں۔ نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب	وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر	طاقت ربا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

در تعریف ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی	زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے	ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے	حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے
مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے	داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے	سرِ پستانِ پری زادسے مانا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے	خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلا کہیے
حجر الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض	نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے
وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق	رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہیے
صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز	میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال پہ کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں ڈھیل

قطعہ

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر۔ ہم خاموش رہتے تھے

بس۔ اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ
قسم لو ہم سے۔ گر یہ بھی کہیں۔ کیوں ہم نہ کہتے تھے

قطعہ

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں	اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے

زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش مری انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھکو اماں
چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھکو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِ ثقیل

دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی داڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

تیرا اندازِ سخن۔ شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم۔ جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

بسخن اوج دہ مرتبۂ معنی و لفظ
بکرم داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر

تم کو دیکھتا اگر اک بار　　پھینکدیتا طلائے دست افشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا　　نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ　　طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم　　ناز پروردۂ بہار ہے آم
خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو　　نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو
وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد　　عدل سے اس کے ہے حمایتِ عہد
فخرِ دیں عزِ شان و جاہ و جلال　　زینتِ طینت و جمالِ کمال
کارفرمائے دین و دولت و بخت　　چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے　　خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے
اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور　　جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور
اس خداوندِ بندہ پرور کو　　وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دل شاد و شادماں رکھیو
اور غالب پہ مہرباں رکھیو

آم کے آگے پیش جائے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے

نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار
جب خزاں آئے تب ہو اسکی بہار

اور دوڑائیے قیاس کہاں
جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
کوہکن باوجودِ غمگینی

جان دینے میں اس کو یکتا جان
پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
کہ دواخانۂ ازل میں مگر

آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام
شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنت سے

انگبیں کے بہ حکمِ رب الناس
بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات
مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

تھا ترنج زر ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد پر کہاں بو باس

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ — اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح۔ ہاں اک نام ہے — دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی پر ستائش نا تمام — عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا
جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل — تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا

تم کرو صاحبقرانی۔ جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

در صفتِ انبہ

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا — شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے — نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے — ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں — آئے یہ گوئے اور یہ میداں

ہم پکاریں۔ اور کھُلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھُلا

ہمکو ہے اس رازداری پر گھمنڈ
دوست کا ہے حال دشمن پر کھُلا

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھُلا

ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کمان
کب کمر سے غمزے کی خنجر کھُلا

مفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ
رہروی میں پردۂ رہبر کھُلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک
آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھُلا

نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھُلا

دیکھیو۔ غالبؔ سے گر اُلجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ۔ اور کافر کھُلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھُلا

خامے نے پائی طبیعت سے مدد
بادباں کے اُٹھتے ہی لنگر کھُلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
عرض سے۔ یاں رتبۂ جوہر کھُلا

مہر کانپا۔ چرخ چکر کھا گیا
بادشہ کا رایتِ لشکر کھُلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب
اب علوِ پایۂ منبر کھُلا

سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس
اب عیارِ آبروئے زر کھُلا

تاجِ زریں، مہرِ تاباں سے سوا　　خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

شاہِ روشن دل، بہادر شہ، کہ ہے　　رازِ ہستی اس پہ سر تا سر کھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں　　مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے　　عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام　　اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے　　واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب　ق　تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب　　تو کہے بتخانۂ آزر کھلا

مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے　　منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک　　میری حدِ وسع سے باہر کھلا

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید　　کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا

باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار　　مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس　　لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا　　کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی — دی بدستور صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے بموجب حکم — اُس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روائیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام

قصیدہ

صبحدم دروازۂ خاور کھُلا — مہرِ عالمتاب کا منظر کھُلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں — شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھُلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود — صبح کو رازِ مہ و اختر کھُلا

ہیں کواکب کچھ۔ نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھُلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو — موتیوں کا ہر طرف زیور کھُلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر — اک نگارِ آتشیں رخ۔ سر کھُلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِّ سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھُلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے — رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھُلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ — کعبۂ امن و اماں کا در کھُلا

وارثِ مُلک جانتے ہیں تجھے
ایرج و تُور و خسرو و بہرام

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے
گیو و گودرز و بیژن و رُہام

ق
مرحبا موشگافیِ ناوک
آفریں آبداریِ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف
تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

ق
رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند
برق کو دے رہا ہے کیا الزام

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

ق
فنِ صورت گری میں تیرا گرز
گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام

ق
اُس کے مضروب کے سر و تن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام

ق
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایام

اور اُن اوراق میں بہ کلکِ قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام

لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کُش
لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں
گنبدِ تیز گردِ نیلی فام

حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
خال کو دانہ اور زلف کو دام

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام

مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز
ماہِ تاباں کا نام شحنۂ شام

کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس — اب تو باندھا ہے دیر میں احرام

اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد — چرخ نے لی ہے جس سے گردش وام

بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار — دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ — اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام؟

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن — نامِ شاہنشہِ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ — مظہرِ ذوالجلالِ والاکرام

شہسوارِ طریقۂ انصاف — نوبہارِ حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز — جس کا ہر قول معنیِ الہام

بزم میں میزبانِ قیصر و جم — رزم میں اوستادِ رستم و سام

اے ترا لطف زندگی افزا — اے ترا عہد فرخی فرجام

چشم بد دور خسروانہ شکوہ — لوحش اللہ عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم — جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

مہر تاباں کو ہو تو ہو۔ اے ماہ
قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجھکو کیا پایۂ روشناسی کا
جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن۔ ماہتاب بن۔ میں کون
مجھکو کیا بانٹ دیگا تو انعام

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھکو فرِّ فروغ
کیا نہ دیگا مجھے مئے گلفام

جبکہ چودہ منازلِ فلکی
کر چکی قطع تیری تیزیِ گام

تیرے پرتوے ہوں فروغ پذیر
کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھکو کِس نے کہا کہ ہو بدنام

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

بوسہ کیسا۔ یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی مہمانی

قصیدہ

مطلع

ہاں مہِ نَو سنیں ہم اُس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب — بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

اُڑ کے جاتا کہاں۔ کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص — حبذا اے نشاطِ عامِ عوام

عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اُس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام

ایک میں کیا۔ کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے — مجھکو سمجھا ہے کیا کہیں نمام

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہے امید گاہِ انام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش — غالب اُس کا مگر نہیں ہے غلام؟

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو — تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام

مجھے بادۂ طرب سے۔ بہ خمار گاہِ قسمت
جو ملی تو تلخ کامی۔ جو ہوئی تو سرگرانی
یہ ستم کرا تو مجھ پر۔ کہ وہ دن گئے کہاں تھی
مجھے طاقت آزمائی۔ تجھے الفت آزمائی
یونہیں دکھ کسی کو دینا نہیں خوب۔ ورنہ کہتا
۴ کہ مرے عدو کو یارب۔ ملے میری زندگانی
ہزار امیدواری۔ رہی ایک اشکباری
نہ ہوا حصولِ زاری۔ بجز آستیں فشانی
کروں عذرِ ترکِ صحبت۔ سو کہاں وہ بیدماغی
نہ غرورِ میرزائی۔ نہ فریبِ ناتوانی
ہمہ یک نفس تپش سے تب و تابِ ہجر مت پوچھ
کہ ستمکشِ جنوں ہوں۔ نہ بقدرِ زندگانی
کفِ موجۂ حیا ہوں بہ گدازِ عرضِ مطلب
کہ سرشک قطرہ زن ہے بہ پیامِ دل ستانی
یہی بار بار جی میں۔ مرے آئے ہے کہ غالب

سرِ شمع نقشِ پا ہے ۔ بہ پاے ناتوانی

شررِ اسیرِ دل کو ملے اوجِ عرضِ اظہار

جو بصورتِ چراغاں ۔ کرے شعلہ زدبانی

ہوے مشقِ جراتِ ناز ۔ رہ و رسمِ طرحِ آداب

خمِ پشتِ خوشنما تھا ۔ بگدازشِ جوانی

اگر آرزو رسا ہو پئے دردِ دل دوا ہو

وہ اجل کہ خوں بہا ہو بشہیدِ ناتوانی

خمِ عجز کا سفینہ بہ کنارِ بیدلی ہے

مگر ایک شہپرِ مور ۔ کرے سازِ بادبانی

مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی

ہوسِ غزل سرائی تپشِ فسانہ خوانی

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی

۴ کبھی کودکی میں جس نے ۔ نہ سنی مری کہانی مطلع ثانی

دلِ ناامید کیونکر بہ تسلی آشنا ہو

جو امیدوار رہیے نہ بمرگِ ناگہانی

تپشِ دلِ شکستہ پئے عبرت آگہی ہے

کہ نہ دے عنانِ فرصت بکشاکشِ زبانی

نہ وفا کو آبرو ہے۔ نہ جفا تمیز جو ہے

چہ حسابِ جانفشانی۔ چہ غرورِ دلستانی

پشکنجِ جستجوہا۔ بسرابِ گفتگوہا

تگ و تازِ آرزوہا بفریبِ شادمانی

نہیں شاہراہِ اوہام بجز آنسوئے رہِ دل

تری سادگی ہے غافل درِ دل پہ پاسبانی

چہ امید و ناامیدی چہ نگاہ و بے نگاہی

ہمہ عرضِ ناشکیبی۔ ہمہ سازِ جانستانی

اگر آرزو ہے راحت۔ تو عبث بخوں طپیدن

کہ خیال ہو تعب کش بہوائے کامرانی

شرر و شرارِ آرزوے۔ تب و تابِ عجز بہتر

نہ کرے اگر ہوس پر غمِ بیدلی گرانی

ہوس فروختن ہا۔ تب و تاب سوختن ہا

قصیدہ فی المنقبت

قلمی

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی ۴

بگمانِ قطعِ زحمت نہ دو چار خامشی ہو
کہ زبانِ سرمہ آلود نہیں تیغ اصفہانی

بہ فریبِ آشنائی بہ خیالِ بیوفائی
نہ رکھ آپ سے تعلق مگر ایک بدگمانی

نظرے سوئے کستاں نہیں غیر شیشہ ساماں
جو گدازِ دل ہو مطلب تو چمن ہے سنگبانی

بفرازِ گاہِ عبرت چہ بہار و کو تماشا
کہ نگاہ ہے سیہ پوش بعزائے زندگانی

بہ فراقِ رفتہ یاراں خط و حرف مو پریشاں
دلِ غافل از حقیقت ہمہ ذوقِ قصہ خوانی

ش مطبوعہ دیوان میں اس قصیدہ کے صرف دو مطلع اور ایک شعر غزلیات کی ضمن میں درج ہیں جو [illegible]

تجھ میں اور غیر میں نسبت ہے ولیکن بہ تضاد		وصیِ ختم رسل تو ہے باثبات یقیں
جسم اطہر کو ترے دوش پیمبر منبر	م	نام نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں
تیری مدحت کے لئے ہیں دل و جاں کام و زباں	م	تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں
آستاں پر ہے ترے جوہر آئینۂ سنگ	م	رقم بندگی حضرت جبریل امیں
تیرے در کے لئے اسباب نثار آمادہ	م	خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں
داد دیوانگی دل کہ ترا مدحت گر		ذرہ سے باندھے ہے خورشید فلک پر آئیں
کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوح خدا	م	کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس بریں
یا علی جنس معاصی اسد اللہ اسد		
جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد	م	کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخی عرض مطالب میں ہے گستاخ طلب	م	ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں
دے دعا کو میری وہ مرتبۂ حسن قبول	م	کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں
غم شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز	م	کہ رہیں خون جگر سے مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفت دلدل میں یہ سرگرمی شوق	م	کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھے جبیں
دل الفت نسب و سینۂ توحید فضا	م	نگہ جلوہ پرست و نفس صدق گزیں
صرف اعدا اثر شعلۂ دود دوزخ	م	وقف احباب گل و سنبل فردوس بریں

جلوہ تحریر ہو نقشِ قدم اُس کا جس جا		
جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اُس کا جس جا	م	وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں
فیضِ خُلق اُس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا	م	بوئے گُل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں
برشِ تیغ کا اُس کی ہے جہاں میں چرچا	م	قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں
کوہ کو بیم سے اُس کی ہے جگر باختگی		نہ کرے نذرِ صدا ورنہ متاعِ تمکیں
کفر سوز اُس کا یہ جلوہ ہے کہ جس سے ہووے		
کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ہووے	م	رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بتخانۂ چیں
وصفِ دلدل ہے مرے مطلعِ ثانی کی بہار		جنبشِ نقشِ قدم سے ہوں ہیں اُس کے نگیں
گو رہے بہ کشِ دیدۂ اربابِ یقیں	مطلع	نقشِ ہر گام دو عالم صفہاں زیرِ نگیں
برگِ گُل کا ہو جو طوفانِ ہوا میں عالم		اُس کے جولاں میں نظر آئے یونہی دامنِ زیں
اُس کی شوخی سے بحیرت کدۂ نقشِ خیال		فکر کو حوصلۂ وسعت اور اک نہیں
جلوۂ برق سے ہو جائے نگہ عکس پذیر		اگر آئینہ سے حیرتِ صورت گر چیں
جاں پناہا دل و جاں فیضِ رسالہا شہا	م	اے کہ تجھ سے ہے بہارِ چمنستانِ یقیں
جاں پناہا دل و جاں فیض رساناشاہا		وصیِ ختمِ رسل تو ہے بفتوائے یقیں
ذوقِ گلچینیِ نقشِ کفِ پا سے تیرے		عرش چاہے ہے کہ ہو در پہ تیرے خاک نشیں

اے عبارت تجھے کس خط سے ہو دعوئ ننگ — اے نگہ تجھکو ہے کس نقطے میں مشقِ تسکیں

کسقدر نالہ پریشاں ہے عیاذاً باللہ — ایک قلم خارجِ آداب و جنون و تمکیں

کسقدر رہزنِ سراہوں کہ عیاذاً باللہ — ایک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں — م

جلوۂ ریگِ رواں دیکھ کہ گردوں ہے ہیچ — خاک پر توڑے ہے آئینۂ نازِ پرویں

شورِ اوہام ہے مست ہوسِ خبثِ نفاق — گفتگو بے مزہ و زخمِ تمنا نمکیں

ختم کر ایک اشارت میں عباراتِ نیاز — جوں مہِ نو ہے نہاں گوشۂ ابرو میں جبیں

نقش لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر — "یا علی" عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں — م

معنیِ لفظِ کرم بسملۂ نسخۂ حسن — قبلۂ اہلِ نظر کعبۂ اربابِ یقیں

جلوہ رفتارِ سرِ جادۂ شرعِ تسلیم — نقشِ پا جسکا ہے توحید کو معراجِ جبیں

کس سے ہو سکتی ہے مدح اسکی بغیر از ہمہ او
کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب — شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں — م

ہو وہ سرمایۂ ایجادِ جہاں نازخرام
ہو وہ سرمایۂ ایجادِ جہاں گرم خرام — ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں — م

مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل — قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجادِ یقیں — م

نسبت نام سے اسکی ہے یہ رتبہ کہ رہے — ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں — م

کس نے دیکھا جگرِ اہلِ جنوں نالہ فروش

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز
م کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

عیشِ بسمل کدۂ عیدِ حریفاں معلوم
خوں ہو آئینہ کہ ہو جامۂ طفلاں رنگیں

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن
م نہ سر و برگِ ستائش نہ دماغِ نفریں

نزعِ مخمور رہوں اُس دید کی دھن میں مجھے
رشتۂ سازِ ازل ہے نگہِ بازپسیں

حیرت آفت زدۂ عرضِ دو عالم نیرنگ
موم آئینہ ایجاد ہے مغزِ بتکیں

وحشتِ دل سے پریشاں ہیں چراغانِ خیال
باندھوں ہوں آئینہ پر چشمِ پری سے آئیں

کوچہ دیتا ہے پریشاں نظری صحرا
رم آہو کو ہے ہر ذرہ کی چشمک میں کمیں

چشمِ امید سے گرتے ہیں دو عالم جوں اشک
پاس پیمانہ کشِ گریۂ مستانہ نہیں

کسقدر فکر کو ہے نالِ قلم موے دماغ
کہ ہوا خونِ نگہ شوق میں نقشِ تمکیں

عذرِ لنگِ آفتِ جولانِ ہوس ہے یارب
جل اُٹھے گرمیِ رفتار سے پائے چوبیں

نہ تمنا۔ نہ تماشا۔ نہ تحیر۔ نہ نگاہ
گرد جوہر میں ہے آئینۂ دل پردہ نشیں

کھینچوں ہوں آئینہ پر خندۂ گل سے مسطر
نامہ عنوانِ بیانِ دلِ آزردہ نہیں

رنجِ تعظیمِ مسیحا نہیں اُٹھتا مجھ سے
درد ہوتا ہے مرے دل میں جو توڑوں بالیں

بسکہ گستاخیِ اربابِ جہاں سے ہوں ملول
پرِ پروانہ مری بزم میں ہے خنجرِ کیں

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
م بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم
م لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

یاس تمثالِ بہار آئینۂ استغنا
وہم آئینۂ پیدائیِ تمثالِ یقیں

خوں ہوا دودۂ عالم سے تمنا کا دماغ
بزمِ یاس آنوئے پیدائی و اخفا نگیں

مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم
م صورتِ نقشِ قدم خاک بفرقِ تمکیں

خانہ ویرانیِ امید و پریشانیِ بیم
جوشِ دوزخ ہے خزانِ چمنِ خلدِ بریں

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
م دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

باد افسانۂ بیماریِ عیسیٰ کا نفس
استخواں ریزۂ موراں ہے سلیماں کا نگیں

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
م سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
م وصل افسانۂ اطفالِ پریشاں بالیں
وصل زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقیں

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
م بیستوں سازِ گرانباریِ خوابِ شیریں
بیستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

موجِ خمیازۂ یک نشہ چہ اسلام و چہ کفر
کجیِ یک خطِ مسطر چہ توہم چہ یقیں

قبلہ و ابروئے بت یک رہِ خوابیدۂ شوق
کعبہ و بتکدہ یک محملِ خوابِ سنگیں

مردمک سے ہو عزا خانۂ یک شہر نگاہ
مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ
م
خاکِ در کی تری جو چشم نہ ہو آئینہ دار

دشمنِ آلِ نبی کو بطرب خانۂ دہر
م
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

دوست اس سلسلۂ ناز کے جوں سنبل و گل
ابر میخانہ کریں ساغرِ خورشید شکار

لنگرِ عیش پہ سرشارِ تماشائے دوام
کہ رہے خونِ خزاں سے بحنا پائے بہار

زلفِ معشوق کشش سلسلۂ وحشتِ ناز
دلِ عاشق شکن آموزِ خمِ طرۂ یار

مے تمثالِ پری نشۂ مینا آزاد
دلِ آئینہ طرب ساغرِ بختِ بیدار

دیدہ تا دل اسد آئینۂ یک جذبۂ شوق
فیضِ الفت سے رقم تا دلِ معنی سرشار
م
دیدہ تا دل اسد آئینۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

قصیدہ فی المنقبت

توڑے ہے عجزِ تنک حوصلہ بر روئے زمیں
فی
سجدۂ تمثال وہ آئینہ کہیں جسکو جبیں

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں [۱]
سہو
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

توڑے ہے نالہ سرِ رشتۂ پاسِ انفاس
سر کرے ہے دلِ حیرت زدہ شغلِ تسکیں

[۱] یہ مشہور مطلع قلمی نسخے میں نہیں ہے۔ غالباً بعد میں بڑھایا گیا ہے۔

آیتِ رحمتِ حق بسملۂ مصحفِ ناز — سطرِ موجہ دیباچۂ درسِ اسرار

قبلۂ نورِ نظر کعبۂ ایجادِ مسیح — مژۂ دیدۂ نخچیر سے نبضِ بیمار

تہمتِ بیخودی کفر نہ کھینچے یا رب — کی ربطِ نیاز و حظِ نازِ بسیار

نازپروردۂ صد رنگِ تمنا ہوں لیے — پرورش پائی ہے جوں غنچہ بجوشِ اظہار

تنگیِ حوصلہ گرداب دو عالم آداب — دیدِ یک غنچے سے ہوں بسملِ نقصانِ بہار

رشکِ نظارہ تھی یک برقِ تجلی کہ ہنوز — تشنۂ خونِ دو عالم ہوں بعرضِ تکرار

وحشتِ فرصتِ یک جیب کشش نے کھویا — صورتِ رنگِ حنا ہاتھ سے دامانِ بہار

شعلہ آغاز و لی حیرتِ داغِ انجام — موجِ مے لیک سرتاقدم آغوشِ خمار

بے اسیرِ ستم کشمکشِ دامِ وفا — دلِ وارستۂ ہفتاد و دو ملت بیزار

مژۂ خواب سے کرتا ہوں بہ آسائشِ درد — بخیۂ زخمِ دلِ چاک بیکدستۂ شرار

محرمِ دردِ گرفتاریِ ہستی معلوم — ہوں نفس سے صفتِ نغمہ بہ بندِ رگِ تار

تھا اسیرِ سلسلہ جنبانیِ صد عمرِ ابد — سازہا مفتِ پریشکدۂ نالۂ زار

لیکن اس رشتۂ تحریر میں سرتاسرِ فکر — ہوں بہ تقدیرِ عددِ حرفِ علی سبحہ شمار

یک طرف نازشِ مژگاں بدگر سو غمِ خار

جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر — م — ایک طرف نازشِ مژگان و دگر سو غمِ خار

ذوقِ تسلیمِ تمنائے بگلزارِ حضور
عوضِ تسخیرِ تماشائے بدامِ اظہار

مطلعِ تازہ ہوا موجۂ کیفیتِ دل
جامِ سرشاریٔ غنچہ لبریزِ بہار

مطلع
فیض سے تیرے ہوا ہے شمعِ شبستانِ بہار
دلِ پروانہ چراغاں پہ بلبل گلزار

شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
جلوہ میں تیرے ہے تسخیرِ ہوائے دیدار

گرد جولاں سے ہے تیری بگریبانِ خرام
جلوۂ خور نمک سودۂ زخمِ تکرار

جس چمن میں ہو ترا جلوۂ محروم نواز
پرِ طاؤس کرے گرمِ نگہ کا بازار

جس ادبگاہ میں تو آئینۂ شوخی ہو
جلوہ ہے ساقیٔ مخموریٔ تابِ دیوار

تو وہ ساقی ہے کہ ہر موجِ محیطِ تنزیہ
کھینچے خمیازہ میں تیرے لبِ ایاغ کا خمار

گردبادِ آئینۂ فتراکِ دماغِ دلہا
تیرِ صحرائے طلب محفلِ پیمانہ شکار

ذوقِ بیتابیِ دیدار سے تیرے ہی خوں
جوشِ جوہر سے دلِ آئینہ گلدستۂ خار

م
تیری اولاد کے غم میں ہے بروئے گردوں
سلکِ اختر میں مہِ نو مژۂ گوہر بار

م
مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبی
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

م
ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مُہرِ نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلہ سے استظہار

تیرا پیمانہ ہے نسخۂ ادوارِ ظہور
تیرا نقشِ قدم آئینۂ شانِ اظہار

ہاں تنک انصاف نوازی کہ اگر ریزۂ سنگ
بے خبر دے بکفِ پائے مسافر آزار

یک بیاباں تپشِ بالِ شرر سے صحرا
مغزِ کہسار میں کرتا ہے فرو نشترِ خار

فرش اس دشتِ تمنا میں نہ ہوتا گر عدل
گرمیِ شعلۂ رفتار سے جلتے خس و خار

ابرِ نیساں سے ملے موجِ گہر کا تاواں
خلوتِ آبلہ میں گم کرے گر تور قفار

یک جہاں بسملِ اندازِ پر افشانی ہے
دام ہے اُس کے قضا کو بے رہائی دشوار

موجِ طوفانِ غضب چشمۂ چرخِ حباب
ذوالفقارِ شہِ مرداں خطِ قدرت آثار

موجِ ابروے قضا جسکے تصور سے دو نیم
بیم سے جسکی دلِ شحنۂ تقدیر فگار

شعلۂ تحریرے اُس برق کی ہے کلکِ قضا
بالِ جبریل سے سطر کشِ سطرِ زنہار

موجِ طوفاں ہو اگر خونِ دو عالم ہستی
بے حنا کو سرِ ناخن سے گذرنا دشوار

دشتِ تسخیر ہو گر گردِ خرامِ دلدل
نعل در آتشِ ہر ذرہ ہے تیغِ کہسار

بالِ رعنائیِ دم موجۂ گل بندِ قبا
گردشِ کاسۂ چشمِ پری آئینہ دار

گردِ راہ اُس کی بھریں شیشۂ ساعت میں اگر
ہر نفس راہ میں ٹوٹے نفسِ لیل و نہار

نرم رفتار ہو جس کوہ پہ وہ برقِ گداز
رفتنِ رنگِ حنا ہے تپشِ بالِ شرار

بے سر اسر رویِ عالمِ ایجاد اُسے
جیبِ خلوتکدۂ غنچہ میں جولانِ بہار

جس کے حیرتکدۂ نقشِ قدم میں پانی
خونِ صد برق سے باندھے بکفِ دستِ نگار

پہنے ہے پیرہنِ کاغذِ ابری نیساں		پر تنک مایہ ہے فریادیِ جوشِ ایثار
وہ شہنشاہ کہ جس کے پئے تعمیرِ سرا	م	چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار
فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور	م	رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار
سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام	م	رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار
واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ	م	وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار
پر یہ دولت تھی نصیبِ نگہِ سعیِ ناز		کہ ہوا صورتِ آئینہ میں جوہر بیدار
ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز	م	گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار
خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا	م	چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار
اے خوشا مکتبِ شوق و بلدستانِ مراد		سبقِ ناز کی ہے عجز کو صد جا تکرار
مشقِ نقشِ قدم نسخۂ آبِ حیواں		جادۂ دشتِ نجف عمرِ خضر کا طومار
جلوہ تمثال ہے ہر ذرۂ نیرنگِ سواد		بزمِ آئینہ تصویر نما مشتِ غبار
دو جہاں طالبِ دیدار تھا یارب کہ ہنوز		چشمکِ ذرہ سے ہے گرم نگہ کا بازار
ہے نفس مایۂ شوقِ دو جہاں یکجولاں		پائے رفتار کم و حسرتِ جولاں بسیار
آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیِ ناز	م	عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار
دشتِ الفت چمن و آبلہ مہماں پرور		دلِ جبریل کفِ پا پہ ملے ہے رخسار

لعل سے کی ہے بہ صرفِ چمن آرائے بہار

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
م طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

کسوتِ تاک میں ہے نشۂ ایجادِ ازل
سبحۂ عرضِ دو عالم بہ کفِ آبلہ دار

بہ نظرگاہِ گلستانِ خیالِ ساقی
بیخودی دامِ رگِ گل سے ہے بیجادہ شکار

بہوائے چمنِ جلوہ ہے طاؤس پرست
باندھے ہے پیرِ فلک موجِ شفق سے زنار

یک چمن جلوۂ یوسف ہے بہ چشمِ یعقوب
لالہ با داغ برافگندہ و گلہا بے خار

بیضۂ قمری کے آئینہ میں پنہاں صیقل
سرو بیدل سے عیاں عکسِ خیالِ قدِ یار

عکسِ موجِ گل و سرشاریِ اندازِ حباب
تنگ آئینۂ کیفیتِ دل سے ہے دوچار

کس قدر سازِ دو عالم کو ملی جرأتِ ناز
کہ ہوا ساغرِ بے حوصلۂ دل سرشار

ورنہ وہ ناز ہے جس گلشنِ بیداد سے تھا
طورِ مشعل بکف از جلوۂ تنزیہ بہار

سایۂ تیغ کو دیکھ اس کے بہ ذوقِ یک زخم
سینۂ سنگ پہ کھینچے ہے الف بالِ شرار

بتکدہ بہرِ پرستش گریِ قبلۂ ناز
باندھے زنارِ رگِ سنگ میانِ کہسار

سبحہ گرداں ہے اسی کے کفِ امید کا ابر
نیم سے جس کے صبا توڑے ہے صد جا زنار

رنگریزِ گل و جامِ دو جہاں ناز و نیاز
اولیں دورِ امامت طرب ایجادِ بہار

جوشِ طوفانِ کرمِ ساقیِ کوثر ساغر
نُہ فلک آئینۂ ایجادِ کفِ گوہربار

ہمتِ نشو و نما میں یہ بلندی ہے کہ سرو
پرِ قمری سے کرے صیقلِ تیغِ کہسار

ہر کفِ خاک جگر تشنۂ صد رنگِ ظہور
غنچے کے میکدہ میں مستِ تامل ہے بہار

کس قدر عرض کروں ساغرِ شبنم یا رب
موجۂ سبزۂ نوخیز ہے لبریزِ خمار

غنچۂ لالہ سیہ مستِ جوانی ہے ہنوز
شبنمِ صبح ہوئی رعشۂ اعضائے بہار

جوشِ بیداد تپش سے ہوئی عریاں آخر
شاخِ گلبن پہ صبا چھوڑ کے پیراہنِ خار

سازِ عریانیِ کیفیتِ دل ہے لیکن
یہ نے تند نہیں موجِ خرامِ اظہار

موجِ مے پر ہے براتِ نگرانی امید
گلِ نرگس سے کفِ جام پہ ہے چشمِ بہار

گلشن و میکدہ سیلابیِ یک موجِ خیال
نشہ و جلوۂ گل بر سرِ ہم فتنہ عیار

میکدے میں ہو اگر آرزوئے گلچینی
م بھول جا یک قدحِ بادہ بطاقِ گلزار

موجِ گل ڈھونڈ بہ طوفان کدۂ غنچۂ باغ
م گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار
موجِ گل ڈھونڈ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ

پشتِ لب حسرتِ خط کھینچے ہے بیجا یعنی
سبز ہے موجِ تبسم بہوائے گفتار

کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر
م سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار

جائے حیرت ہے کہ گلبازیِ اندیشۂ شوق
اس زمیں میں نہ کرے سبز قلم کا رفتار

۱؎ متن میں پہلے "جوشِ بیداد تپش" کی جگہ "بیدمانی تپش" تھا۔

حسرتِ جلوۂ ساقی ہے کہ ہر پارۂ ابر — سینہ بیتابی سے ملتا ہے بہ تیغِ کہسار

دشمنِ حسرتِ عاشق ہے رگِ ابرِ سیاہ — جس نے برباد کیا ریشۂ چندیں شبِ تار

مستیِ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت — م — کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بلبل — راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

چشم بر چشم چنے ہے بہ تماشا مجنوں — ہر دو سو خانۂ زنجیرِ نگہ کا۔ بازار

خانۂ تنگ ہجومِ دو جہاں کیفیت — جامِ جمشید ہے یاں قالبِ خشتِ دیوار

سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم — م — سرنوشتِ دو جہاں ابر بہ یک سطرِ غبار

کفِ ہر خاکِ چمن آئینۂ قمری صیقل

کفِ ہر خاکِ بگردوں شدہ قمری پرواز — م — دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤسِ شکار

سنبل و دامِ کمیں خانۂ خوابِ صیاد — نرگس و جامِ سیہ مستیِ چشمِ بیدار

طرہ ہا بسکہ گرفتارِ صبا ہیں۔ شانہ — زانوئے آئینہ پر مارے ہے دستِ بیکار

بسکہ گیرنگ میں دل کرتی ہے ایجادِ نسیم — لالہ کے داغ سے جوں نقطہ و خطِ سنبل زار

اے خوشا فیضِ ہوائے چمنِ نشو و نما — بادہ پرزور و نفس مستِ مسیحا بیمار

جوہرِ ناخنِ بریدہ بہ اندازِ ہلال — ریشۂ عجز کو کرتا ہے نمو سے سرشار

کاٹ کر پھینکیے ناخن۔ تو بہ اندازِ ہلال — آ — قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

دل ز کار افتاد و پا واماند و دست از ہم شکست ‖ قطعِ منزل کے تواں کردن بدیں حالِ خراب

مدعا را بر زبان آوردن از بیگانگی است ‖ جز نگاہت شاہدِ ما را کفن بادا نقاب

ذوقِ طلب ز تو و من از تو طلب ز تو ‖ خود تو می بخشی و می فہمی زبانِ اضطراب

شعلۂ شوق ہوس دارم ز سودائے جنوں ‖ م ‖ کاتشِ افسردہ را بخشد بہارِ التہاب

دین و دنیا را بلاگردانِ نازت کردہ ام ‖ جلوۂ رنگیں ترا از صد گلشنِ خلد انتخاب

حرمتِ جانِ محمدؐ یک نظر کن سوئے من

یا علیؑ یا مرتضیٰؑ یا ابوالحسنؑ یا ابو ترابؑ

قصیدہ

حیدری بہ تمہید بہارِ مغفرت

ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار ‖ قلمی ‖ سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

مستیٔ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ ‖ م ‖ ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

سنگ پہ کارگہِ ربطِ نزاکت ہے کہ ہے ‖ خندۂ جوہرِ کبک بہ دندانِ شرار

سبز جوں جامِ زمرد۔ نہ ہو گر داغِ پلنگ ‖ نشۂ نشو و نما کو سمجھ افسونِ بہار

سبزہ ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ ‖ مطبعہ ‖ تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

کشتۂ افعیٔ زلفِ سیہِ شیریں کو ‖ بے ستوں سبزہ سے ہے سنگِ نئے مرد کا مزار

بعد ازیں بہر ظہور مہدی صاحب زماں م ظلمت آباد شب کفر و حسد را آفتاب

ابر لطفش ز آتش و دوزخ برالاید بہشت م برق قہرش ابر رحمت را کند دود کباب

چند اسماء خلفا کز پے تعمیر دیں م در کف از سر رشتۂ شرع نبی دارد طناب

میکند از ہم جدا صراف حکم قدرتش م در سیاستگاہ صفت مس ز سیم ماہتاب

بعد ازیں بہر شہید انکہ خوش جاں داده اند م در شہادتگاه شاه کربلا را در رکاب

گشتہ از بہر ترویج علمدار حسین م پیشوائے لشکر شبیر ابن بوتراب

حضرت عباس عالی رتبہ کز چوگان او م می رود مانند گوے بے سر و پا آفتاب

بعد ازیں تا غیر دیجوئی دعائے زمرہ ایست م کز قلق دارند در دل آتش و در چشم آب

بادشاہاں ہوسناں جنت نصیباں عاشقاں م بیدلاں یعنی عزاداران آل بوتراب

راقم بیچارۂ پژمرده دل یعنی اسد م کز فسردنہائے دل گردیده پابند حباب

بر زباں مہر خموشی و بہ دل جوش جنوں . در ہوس آبا و نادانی اسیر پیچ و تاب

نقد آگاہی بوہم فرصتے در باختہ م دست خالی بر سر و دل پایمال اضطراب

غافل از رفتار عمر و فارغ از تکمیل عشق م کرده آغوش و داغ دل نشیمنگاه خواب

بسکہ در صحرائے وحشت عقل و دیں درباختہ م لذت قند محبت جویدا از زہر عتاب

خود تو میدانی کہ گم گردیدۂ دشت امید م تشنہ تر میگردد از بے آبی موج سراب

بهر ترویجِ شفیعِ عاصیان یعنی حسینؑ — آنکه جنت راست از اشکِ عزادارش آب

بادشاهِ صابرے۔ دریادے۔ تشنه لبے — کز غمش از لعل خون بارست چشمِ آفتاب

شاهِ غیرت آفرینے۔ کز پے تعلیمِ صبر — بخیهٔ نقشِ قدم زد۔ بر لبِ موجِ سراب

عاشقِ الله و معشوقِ وفادارِ رسولؐ — م — قبلهٔ عشق و پناهِ حسن و جانِ بوتراب

وز گمش را مخلِ خوابِ زلیخا۔ فرشِ راه — م — خیمه گاهش را نگاهِ ماهِ کنعانی طناب

بهر ترویجِ امام ابنِ امام ابنِ امام — م — آدمِ آلِ عبا۔ شاهنشهِ عالی جناب

آستانش عالی و منزلگهِ قدرش رفیع — بارگاهش عرش سامان و جنابش مستطاب

لاله را هم رنگیِ چشمِ بخون آلوده اش — م — میزند بر فرق از داغِ غلامی انتخاب

بهر ترویجِ محمد باقرِؑ جهد رنزا و — کز خیالِ آستان بوسیش می قصد ثواب

بهر ترویجِ محمد جعفرِ صادق آفرین — عالمِ علمِ نبی و واقفِ سرِّ کتاب

بهر ترویجِ شهِ کاظمؑ که در بحرِ عالم است — م — چون قضا حکمش روان و چون قدر رایش صواب

بهر ترویجِ رضا شاهِ خراسان کز کرم — بهر تعمیرِ جهان از کهکشان دارد طناب

بهر ترویجِ تقیؑ کاندر تماشاگاهِ دوست — م — طاقِ ایوانِ آسمان آئینهٔ او آفتاب

بهر ترویجِ نقیؑ کز بهرِ تقریبِ نیاز — م — تحفه آورد دستِ نرگسدان به بزمش ماهتاب

بهر ترویجِ حسنؑ پشت و پناهِ خافقین — شاهِ کیوان بارگاه و خسروِ جنت جناب

در پناهِ عفتش حورانِ جنت را هنوز | پنبهٔ روزن بود چشمِ سفیدِ ماهتاب

سایه‌اش جز در حریمِ قدس نتوان یافتن | م | گر شکستِ رنگِ امکان عصمتش دارد نقاب

بهرِ ترویجِ خدائے از دو عالم رستگان | م | عابد الله و بهبود و خلائق بوتراب

مهربان پیرے که بهرِ دیدنِ ماهِ صیام | در کفِ مستانِ او تیغے است از موجِ شراب

بادهٔ خمخانهٔ او پرتوِ نورِ جمال | پنبهٔ مینائے او چشمِ سفیدِ ماهتاب

شهسوارِ قدرتے کز فرطِ تعظیم و جلال | سرمه در چشمِ رکابش می‌کشد گردِ رکاب

ذوالفقارش شاهدے کاندر تماشاگاهِ قتل | م | میکشد در شوقِ او از موجِ الف بر جبین آب

در خیالِ صدمهٔ جاندادگانِ ضربتش | م | می‌جهد از دیدهٔ خیبر چراغِ آفتاب

دلدلِ برق آفرینش راهرے کاندر خیال | م | می‌جهد چون نگاه از حلقهٔ چشمِ رکاب

بسکه شد ویرانِ شوخی خانهٔ نظاره‌اش | عینکِ پیرِ فلک گردیده ماه و آفتاب

بهرِ ترویجِ حسن فرمان ده اقلیم دین | م | خسروِ عرش آستان شاهنشهِ قدرت‌مآب

ناظمِ حسن آفرینی کز برائے خدمتش | از شفق بندد حنا بر شام دستِ آفتاب

جلوه ریز آید اگر لطفش به هنگامِ غضب | دودِ آتش می‌شود بارانِ رحمت سحاب

بشکنه شان تغافل گر به دلداریِ ناز | لذتِ قندِ محبت جو شد از زهرِ عتاب

تو بین قدرش که عرش و خلد جولانگاهِ اوست | م | از خمِ زانوے جبریلِ امین دارد رکاب

قصائد

فاتحۂ فارسی

بہر ترویج جناب والی یوم الحساب م خامۂ من تعمیر قصرستان دلہائے خراب

جرم بخشائے کہ گر جو شد بہار رحمتش م برفشائے خویش لرزد چوں دلِ مجرم عذاب

زافتش اعدائے اورا در شمار سالِ عمر م نعل وارثوں بند داز ناخن بگشتِ حساب

نوح عمرے ماند طوفانی بہ بحرِ وحدتش م تا سر و زانو بہ موجے باخت مانندِ حباب

تحفہ۔ چوں خوں در رگ ابریشم سازا فسرد م ہیبت نہیش اگر جو شد بوضع احتساب

بارگاہش را زخورشید است خشتِ آستاں م شمع بزمش است گلگیر از دو لخت ماہتاب

ہم چمن زار ازل راقدر تش رنگ آفریں ہم گلستانِ ابد را خوئے جاں بخشش سحاب

بہر ترویج جناب اقدسے کز حکم او م صیقلِ آئینہ بر نورِ نظر ریزد حجاب

آستانش بر نشانگاہِ جلائے کز ادب م حلقۂ بیرونِ در گردیدہ چشمِ آفتاب

لہ یہ فاتحہ دیوان غالب فارسی مطبوعہ نولکشور کے صفحہ ۲۹۰ پر باختلافات خفیف درج ہے۔ لیکن چونکہ قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں متعدد اشعار کی کمی بیشی ہے اسلئے یہاں قلمی نسخے کے اشعار کو پورا نقل کردیا ہے اور جو شعر دونوں دیوانوں میں مشترک نہیں انکو "م" سے ممتاز کردیا ہے۔ بخوف طوالت مطبوعہ شعروں کے اختلافات دکھانے کی ہم نے جرأت نہیں کی۔ ارباب ذوق مطبوعہ دیوان سے مقابلہ فرماسکتے ہیں۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لئے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی [۱]
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

تم ہو بت پھر تمھیں پندارِ خدائی کیوں ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یا رب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرتِ ماہ
ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

حسن میں حور سے بڑھکر نہیں ہونے کی کبھی
آپکا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

تیرے کوچہ کا ہے مائل دلِ مضطر میرا
کعبہ اک اور سہی قبلہ نما اور سہی

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

مجھکو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی آبِ بقا اور سہی

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیدادگرِ رنج فزا اور سہی

۱ یہ غزل غالب نے اپنے ایک خط میں لکھی ہے جو اردوئے معلی اور دیوان غالب مطبوعہ بدایوں کے آخر میں موجود ہے

دراز دستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے۔ کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری خوشامد سے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

دیا ہے خلق کو بھی۔ تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

نصیرِ دولت و دیں۔ اور معینِ ملّت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

غالب۔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کے لئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر!
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں

نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے

پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب

عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر۔ ہر ایک گل و لالہ پر خیال

صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا

جاں نذرِ دلفریبیٔ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس

زلفِ سیاہ۔ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو

سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ

چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کیے ہوئے
پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب

یہ رنج۔ کہ کم ہے مئے گلفام۔ بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

نے تیر کماں میں ہے۔ نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کیا زُہد کو مانوں۔ کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی۔ طمعِ خام۔ بہت ہے

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام۔ بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے۔ جامۂ احرام بہت ہے

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات۔ کہ اُن کو
انکار نہیں۔ اور مجھے ابرام بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ!
رہنے دے مجھے یاں۔ کہ ابھی کام بہت ہے

واعظ۔ نہ تم پیو۔ نہ کسی کو پلا سکو۔
کیا بات ہے۔ تمھاری شراب طہور کی
لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل۔ کہ کیوں اُٹھا
گویا۔ ابھی سُنی نہیں آواز صُور کی
آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی
گر۔ واں نہیں۔ پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے اِن بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی
کیا فرض ہے۔ کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ۔ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طُور کی
گرمی سہی کلام میں۔ لیکن نہ اِس قدر
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی
غالب۔ گر اِس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے

ہوئی صبح ۔ اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی

پھر آیا وہ زمانہ ۔ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی

وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا

اُسی کو دیکھکر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ

پر اتنا جانتے ہیں ۔ کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

ہوں مَیں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے ۔ کہ مطلب ہی بر آوے

منظور تھی یہ شکل ۔ تجلی کو نور کی

قسمت کھُلی ترے قد و رخ سے ۔ ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں

پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

وہ دادو دید گرانمایہ شرط ہے ہمدم
وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہمکو بھی لیکن اب اُس میں دم کیا ہے

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی
اِترائے کیوں نہ خاکِ سرِ رہگزار کی

جب اُس کے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے
کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اُسکی گردن پر
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھلجائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط - تو ہم سے لکھوائے

چال جیسے کڑی کمان کا تیر	دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے	وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ	کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سنو۔ گر برا کہے کوئی	نہ کہو۔ گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی	بخش دو۔ گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند	کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے	اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

بہت سہی غمِ گیتی۔ شراب کم کیا ہے	غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں۔ مجھکو غم کیا ہے
تمہاری طرزِ روش جانتے ہیں ہم کیا ہے	رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے
کٹے تو شب کہیں۔ کاٹے تو سانپ کہلاوے	کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بخم کیا ہے
لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود	کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے
نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا	خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

۱؎ مطبوعہ دیوانوں میں اس غزل کے صرف تین شعر ہیں۔ اردوئے معلیٰ ص ۲۹۰ پر بقیہ اشعار یہ ہیں جو مرزا علاء الدین احمد خاں کی فرمائش پر لکھے گئے تھے۔

دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

صرف بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی
تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟
پردے میں گل کے، لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا؟
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ، کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اُٹھائی کل اس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنیے
جو ناسزا کہے اُس کو نہ ناسزا کہیے
کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھیے
کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے
رہے نہ جان۔ تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان۔ تو خنجر کو مرحبا کہیے
نہیں نگار کو اُلفت نہ ہو۔ نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو۔ بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے
سفینہ جبکہ کنارے پہ آ لگا۔ غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے

آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالبؔ کو برا کیوں کہو۔ اچھا مرے آگے

کہوں جو حال تو کہتے ہو "مدعا کہیے"
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو۔ تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں"
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اُتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

نہیں ذریعۂ راحت۔ جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جسکو کہ دلکشا کہیے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ۔ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ۔ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو۔ خود بین و خود آرا ہوں۔ نہ کیوں ہوں؟
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھدے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیونکر کہوں۔ لو نام نہ ان کا مرے آگے"

ایماں مجھے روکے ہے۔ جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلےٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پہ وصل میں یوں مر نہیں جاتے

وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

کیا تعجب ہے۔ کہ اُس کو دیکھ کر آ جائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا۔ پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ۔ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زُلف گر بن جاؤں تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم۔ مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھے

خدایا جذبۂ دل کی۔ مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھے

وہ بد خو، اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر۔ قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھے

اُدھر وہ بدگمانی ہے۔ ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی۔ لیکن
وہ دیکھا جائے کب۔ یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے۔ نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھسے۔ نہ ٹھہرا جائے ہے مجھے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب

ہنوز اُس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اُسے یوسف کی بوے پیرہن کی آزمائش ہے

وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رہے دل ہی میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو، بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سُبحہ و زنّار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ، اے دلِ وابستہ، بیتابی سے کیا حاصل؟
مگر پھر تابِ زلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو!
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آئیں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا، غالب
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے، کہ سرِ رہ گزر ہے، کیا کہیے

تمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا؟ کہیے!

انھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیے
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

کہا ہے کس نے کہ غالبؔ برا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں، قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر

خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

کبھی تو اِس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے

کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

بجا ہے۔ گر نہ سُنے نالہائے بلبلِ زار

کہ گوشِ گل۔ نمِ شبنم سے۔ پنبہ آگیں ہے

اسدؔ ہے نزع میں چل بیوفا برائے خدا

مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

دیا ہے دل اگر اُس کو بشر ہے کیا کہیے

ہوا رقیب۔ تو ہو۔ نامہ بر ہے۔ کیا کہیے

یہ ضد کہ آج نہ آئے۔ اور آئے بن نہ رہے

قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے۔ کیا کہیے

رہے ہے یوں گہہ و بےگہہ کہ کوئے دوست کو اب

اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے۔ کیا کہیے؟

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب

کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے
اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے۔ نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے؟ اے نہیں ہے"

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ۔ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں۔ وے اُنکی تمنا نہیں کرتے

در پردہ اُنھیں۔ غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے
غالب کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے۔ اور بجھائے نہ بنے

وہ آ کے خواب میں۔ تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے
کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے
پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے۔ شراب تو دے
اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے۔ ذرا میرے پاؤں داب تو دے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے
کیوں بوتے ہیں باغباں تونبے
گر باغ گدائے مے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل!
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے۔ کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو۔ کہ اگر
کوئی پوچھے کہ "یہ کیا ہے"؟ تو چھپائے نہ بنے

اِس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا؟
ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری

متقابل ہے مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

گردِ بادِ رہِ بیتابی ہوں
صرصرِ شوق ہے بانی میری

دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچمدانی میری

کر دیا ضعف نے عاجز غالب
ننگِ پیری ہے جوانی میری

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا۔ مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہِ دیندار نے شفا پائی

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خوں نابہ فشانی میری

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو ملجائے تو دریا ہوجائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت۔ لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ۔ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

کیوں شاہدِ گُل باغ سے بازار میں آوے

تب۔ چاکِ گریباں کا مزہ ہے دلِ نالاں

جب اک نفس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے

آتش کدہ ہے سینہ مرا۔ رازِ نہاں سے

اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

حُسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے

اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ

جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے۔ اگر ٹوٹ گیا

ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

بے طلب دیں تو مزا اُس میں سوا ملتا ہے

وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

تب نازِ گراں مائگیِ اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے

دے مجھکو شکایت کی اجازت۔ کہ ستمگر
پھر تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئینہ۔ گفتار میں آوے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب!
اک آبلہ پا وادیِ پرخار میں آوے

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے۔ جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے

غارت گرِ ناموس نہ ہو۔ گر ہوسِ زر

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو۔ کیا ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے۔ کہ آرزو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں۔ غالب کی آبرو کیا ہے

میں انھیں چھیڑوں۔ اور وہ کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

قہر ہو۔ یا بلا ہو۔ جو کچھ ہو۔
کاش کے۔ تم مرے لیے ہوتے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

آہی جاتا وہ راہ پر۔ غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

آستاں پر ترے ہر۔ ناصیہ سا ہوتا ہے
میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم۔ ذوق فزا ہوتا ہے
رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم "کہ تو کیا ہے"
تمھیں کہو۔ کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
نہ شعلے میں یہ کرشمہ۔ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ۔ کہ وہ شوخِ تُند خو کیا ہے
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ۔ خوفِ بد آموزیِ عدو۔ کیا ہے
چپک رہا ہے لہو سے بدن پہ پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اَب راکھ جستجو کیا ہے

سست رَو، جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد؟ کہ ہم

آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ

کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا، اور اب

لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

ق

خامہ میرا، کہ وہ ہے باربُدِ بزمِ سخن

شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم

تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے

تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمھارے آئیو اے طرّہ ہائے خم بہ خم آگے

دل و جگر میں پَر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالبؔ
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال

دامنِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ۔ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے۔ آکر۔ تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے۔ سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ۔ نوائے سروش ہے

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے
قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت
فقط "خراب" لکھا۔ بس نہ چل سکا قلم آگے
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب

اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا

کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

دیدار بادہ۔ حوصلہ ساقی۔ نگاہ مست

بزمِ خیال۔ مے کدۂ بے خروش ہے

ق

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

زنہار۔ اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے۔ جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

میری سنو۔ جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ۔ دشمنِ ایمان و آگہی

مطرب بہ نغمہ۔ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے۔ کہ ہر گوشۂ بساط

تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اللہ ری تیری تندیٔ خو جس کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اٹھ گئے وہی اُن کے عَلَم ہوئے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال، نہ نظّارۂ جمال

ق

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز — گرم بازارِ فوجداری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر — زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال — ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب — اشکباری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اُس کی روبکاری ہے

بیخودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری۔ اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر؟
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے
کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے
اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشم دلّالِ جنسِ رسوائی
دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشکباری ہے
دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بیقراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے
روزِ بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اُسی بیوفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"

ہوں کشمکشِ نزع میں۔ ہاں جذبِ محبت!
کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں۔ گو آئے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

جلّاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہلِ طلب۔ کون سنے طعنۂ نایافت

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی؟

کیوں نہ چیخوں؟ کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس مُنہ سے جاوٴگے غالب
شرم تمکو مگر نہیں آتی؟

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو۔ کہ مدعا کیا ہے؟

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا!
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں - وہ جوانی کدھر گئی؟

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

اپنی گلی میں مجھکو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج - ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جسقدر ملے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

بس ہجومِ نا امیدی! خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

رنجِ رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی کو عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر۔ کہ کس مشکل میں ہے

دل آپ کا، کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا؟
دل لیجیے، مگر مرے ارماں نکال کے

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراغ!
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں!
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

سادگی پر اُس کی۔ مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے۔ با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

آبگینہ۔ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یارب وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دُور چشمِ بد۔ تری بزمِ طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے واں۔ گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل۔ پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ۔ وہ پا جائے ہے

اُس کی بزم آرائیاں سن کر۔ دلِ رنجور۔ یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر۔ بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رُخ۔ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے۔ جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

نقش کو اُس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جسقدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

بے صرفہ ہی گذرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے

گھر میں تھا کیا؟ کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

پینس میں گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

عشق مجھکو نہیں۔ وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے۔
کچھ نہیں ہے۔ تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں۔ غفلت ہی سہی

عمر ہرچند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں؟
نہ سہی عشق۔ مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ نا انصاف!
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(۳)

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی
رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مےِ ذات چاہیے

نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

غالب ترا احوال سنا دینگے ہم اُن کو
وہ سُن کے بُلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

سہ یہاں سے ردیف (ی) کی مطبوعہ غزلیں شروع ہوتی ہیں جنکا ہمطرح کوئی شعر قلمی نسخے میں نہیں ہے۔

نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی ہے
تماشائے کہ رنگِ رفتہ بر گردیدنی جانے
اسدؔ! جاں نذرِ الطافے کہ ہنگامِ ہم آغوشی
زبانِ ہر سرِ مو حالِ دل پرسیدنی جانے

سوختگاں کی خاک میں ریزشِ نقشِ داغ ہے
آئینۂ نشانِ حال۔ مثلِ گلِ چراغ ہے
لطفِ خمارِ مے کو ہے دردِ دلِ اسدؔ اگر
پنبۂ شیشۂ شراب کف بہ لبِ ایاغ ہے
صفتِ صفائے طبع ہے جلوۂ تازِ سوختن
داغِ دلِ سیہ دلاں مردمِ چشمِ زاغ ہے
رنجشِ یارِ مہرباں۔ عیش و طرب کا ہے نشاں
دل سے اُٹھے ہے جو غبار۔ گردِ سوادِ باغ ہے
شعر کی فکر کو اسدؔ! چاہیے ہے دل و دماغ
عذر کہ یہ فسردہ دل بے دل و بے دماغ ہے

ہوئے نہ غبارِ دلِ تسلیم زمیں گیری		مغرور نہ ہو ناداں۔ سرتاسر گیتی ہے

رکھ فکرِ سخن میں تو معذور مجھے غالبؔ
یاں زورقِ خودداری طوفانیِ معنی ہے

اگر گل حسن و الفت کی بہم جوشیدنی جانے
پرِ بلبل کے افسردن کو دامن چیدنی جانے
فسونِ حسن سے ہے شوخیِ گلگونہ آرائی
بہار اس کی کفِ مشاطہ میں بالیدنی جانے
نوائے بلبل و گل پاسبانِ بیدماغی ہے
بہ یک مژگانِ خوباں صد چمن خوابیدنی جانے
ترے شب زندہ دارِ انتظارستاں کہ وحشت سے
مژہ در پیچ ہے۔ سوزن آسا چیدنی جانے
خوشا شوقے کہ جوشِ حیرت اندازِ قاتل سے
نگہ شمشیر میں۔ جوں جوہر آرامیدنی جانے
جفا شوخ و ہوس گستاخِ مطلب ہے۔ مگر عاشق
نفس در قالبِ خشتِ لحد دزدیدنی جانے

نقدِ رنجم تا بکے۔ از کیسہ بیروں ریختن
یعنی اے پیرِ فلک! شامِ جوانی مفت ہے
گر نہیں پاتا درونِ خانہ ہر بیگانہ جا
بر درِ نکشودۂ دل پاسبانی مفت ہے
چونکہ بالائے ہوس پہ ہر قبا کوتاہ ہے
بر ہوسہائے جہاں دامن فشانی مفت ہے
یک نفس ہر یک نفس جاتا ہے قسطِ عمر میں
حیف ہے اُن کو جو کھوویں زندگانی مفت ہے
مال و جاہ و دست و پائے زرخریدہ ہیں اسدؔ!
پس بہ دلہائے دگر راحت رسانی مفت ہے

بیتابیِ یادِ دوست۔ ہمرنگِ تسلی ہے
شگفت کشی ہستی بدنامِ دو رنگی ہے
ویدن ہمہ بالیدن۔ گردن ہمہ افسردن
وہمِ طرب ہستی۔ ایجادِ سیہ مستی
زندانِ تحمل ہیں۔ مہمانِ تغافل ہیں

موجِ تپشِ مجنوں۔ محملکشِ لیلی ہے
یاں تیرگیِ اختر خالِ رخِ زنگی ہے
خوشتر ز گل و غنچہ چشم و دلِ ساقی ہے
تسکیں دہ صد محفل یک ساغرِ خالی ہے
بے فائدہ یاروں کو فرقِ غم و شادی ہے

تا کب دلِ شانہ کشِ طرّہ تحریر آوے

تا چند نفس غفلتِ ہستی سے بر آوے
قاصد تپشِ نالہ سے۔ یارب خبر آوے

ہے طاقِ فراموشیِ سودائے دو عالم
وہ سنگ کہ گلدستۂ جوشِ شرر آوے

درد۔ آئینۂ کیفیتِ صد رنگ ہے۔ یارب!
خمیازۂ طرب ساغرِ زخمِ جگر آوے

جمعیتِ آوارگیِ دیدہ نہ پوچھو
دل تا مژہ آغوشِ وداعِ نظر آوے

اے ہرزہ دویِ بہتِ تمکینِ جنوں کھینچ
تا آبلہ ممالکشِ موجِ گہر آوے

زاہد کو جنوں سبحۂ تحقیق ہے۔ یارب!
زنجیریِ صد حلقۂ بیرونِ در آوے

وہ تشنۂ سرشارِ تمنا ہوں کہ جس کو
ہر ذرہ بہ کیفیتِ ساغر نظر آوے

تمثالِ بتاں۔ گر نہ رکھے۔ پنبۂ مرہم
آئینہ بہ عریانیِ داغِ جگر آوے

ہر غنچہ۔ اسدؔ! بارگہِ شوکتِ گل ہے
دل فرشِ رہِ ناز ہے۔ بیدل اگر آوے

چار سوئے عشق میں صاحب دکانی مفت ہے
نقد ہے داغِ دل اور آتش زبانی مفت ہے

زخمِ دل پر باندھیے حلوائے مغزِ استخواں
تندرستی فائدہ اور ناتوانی مفت ہے

حکمِ بیتابی نہیں اور آرمیدن منع ہے
باوجودِ شوق وحشت نارمیدن منع ہے

شرمِ آئینہ تراشِ جبہۂ طوفان ہے
آب گردیدن روا لیکن چکیدن منع ہے

بیخودی فرمانروائے حیرت آبادِ جنوں
زخم دوزی جرم و پیراہن دریدن منع ہے

مژدۂ دیدار سے رسوائیٔ اظہار دور
آج کی شب چشم کو کب تک پریدن منع ہے

بیمِ طبعِ نازکِ خوباں سے وقتِ سیرِ باغ
ریشۂ زیرِ زمیں کو بھی دویدن منع ہے

یار مغرورِ تغافل ہم عزیزاں! شفقتے!
نالۂ بلبل بہ گوشِ گل شنیدن منع ہے

مانعِ بادہ کشی ناداں ہے لیکن اے اسدؔ!
بے ولائے ساقیِ کوثر کشیدن منع ہے

قتلِ عشاق نہ غفلت کشِ تدبیر آوے
یا رب! آئینہ بہ طاقِ خمِ شمشیر آوے

بالِ طاؤس ہے رعنائیٔ ضعفِ پرواز
کون ہے داغ؟ کہ شعلہ کا عناں گیر آوے

عرضِ حیرانیِ بیمارِ محبت معلوم
عیسیٰ آخر بہ کفِ آئینہ تصویر آوے

ذوقِ راحت اگر احرامِ تپش ہو جوں شمع
پائے خوابیدہ بہ دلجوئیِ شبگیر آوے

اس بیاباں میں گرفتارِ جنوں ہوں کہ جہاں
موجۂ ریگ سے دل پائے بہ زنجیر آوے

وہ گرفتارِ خرابی ہوں کہ فوارہ نمط
سیلِ صیاد کمیں خانۂ تعمیر آوے

سرِ معنی بہ گریبانِ شقِ خامہ اسدؔ

سویداے مردمِ چشمِ پری نظارہ افسوں ہے

فنا کرتی ہے زائل سرنوشتِ کلفتِ ہستی

سحر از بہرِ شست و شوے داغِ ماہ صابوں ہے

اسدؔ ہے آج مژگانِ تماشا کی حنا بندی

چراغانِ نگاہ و شوخیِ اشکِ جگر گوں ہے

گداے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

فسردگی میں ہے فریادِ بیدلاں تجھ سے
چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے

بہارِ حیرتِ نظارہ سخت جانی ہے
حناے پاے اجل خونِ کشتگاں تجھ سے

پری بہ شیشہ و عکسِ رخ اندر آئینہ
نگاہِ حیرتِ مشاطہ خوں فشاں تجھ سے

طراوتِ سحر ایجادیِ اثر یکسو
بہارِ نالہ و رنگینیِ فغاں تجھ سے

چمن چمن گل آئینہ در کنارِ ہوس
امیدِ محوِ تماشاے گلستاں تجھ سے

نیاز پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے
جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے آستاں تجھ سے

بہانہ جوئیِ رحمت کمیں گرِ تقریب
وفاے حوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے

اسدؔ! بہ موسمِ گل در طلسمِ کنجِ قفس
خرام تجھ سے صبا تجھ سے گلستاں تجھ سے

کاشانۂ ہستی کہ برانداختنی ہے
ہے شعلۂ شمشیرِ فنا۔ حوصلہ انگار
جز خاک بسر کردنِ بے فائدہ حاصل؟
اے بے ثمراں! حاصلِ تکلیفِ دمیدن

یاں سوختنی چارہ گرِ ساختنی ہے
اے داغِ تمنا! سپر انداختنی ہے
ہر چند بہ میدانِ ہوس تاختنی ہے
گردوں۔ یہ تماشائے گل افراختنی ہے

ہے سادگیِ ذہن۔ تمنائے تماشا
جائے کہ اسد رنگِ چمن باختنی ہے

گلستاں۔ بے تکلف پیشِ پا افتادہ مضموں ہے
جو تو باندھے کفِ پا پر حنا۔ آئینہ موزوں ہے
بہارِ گل، دماغ نشۂ ایجادِ مجنوں ہے
ہجومِ برق سے چرخ و زمیں یک قطرہ خوں ہے
رجوعِ گریہ سوئے دل۔ خوشا سرمایہ طوفاں
بر انگشتِ حسابِ اشک۔ ناخن نعلِ واژوں ہے
عدم وحشت سراغ۔ و ہستی آئینِ بندِ رنگینی
دماغِ دو جہاں پر سنبل و گل یک شبیخوں ہے
تماشا ہے علاجِ بیدماغیہائے دل۔ غافل

ز خود گذشتنِ دل کاروانِ حیرت ہے
نگہ غبارِ ادبگاہِ جلوہ فرمائی

بہ چشمِ در شدہ مژگاں ہے جوہرِ رگِ خواب
نہ پوچھ۔ نازکئِ وحشتِ شکیبائی

خرابِ نالۂ بلبل۔ شہیدِ خندۂ گل
ہنوز دعوئے تمکین و بیمِ رسوائی

شکستِ سازِ خیال آں سوے گریۂ غم
ہنوز نالہ پر افشانِ ذوقِ رعنائی

ہزار قافلۂ آرزو بیاباں مرگ
ہنوز محملِ حسرت بہ دوشِ خود رائی

وداعِ حوصلہ۔ توفیقِ شکوہ۔ عجزِ وفا
اسدؔ! ہنوز گمانِ غرورِ دانائی

کوشش ہمہ بیتابِ تردد شکنی ہے
صد جنبشِ دل یک مژہ برہم زدنی ہے

گو حوصلہ پا مزدِ تغافل نہیں۔ لیکن
خاموشئِ عاشق گلۂ کم سخنی ہے

دی لطفِ ہوا نے۔ بہ جنوں طرفہ نزاکت
تا آبلہ دعوائے تنک پیرہنی ہے

رامشگرِ اربابِ فنا۔ نالۂ زنجیر
عیشِ ابد از خویش بروں تاختنی ہے

ازبسکہ ہے محو بہ چمن تکیہ زدنہا
گل برگ پر بالشِ سروِ چمنی ہے

آئینہ و شانہ۔ ہمہ دست و ہمہ زانو
اے حسن! اگر حسرتِ پیماں شکنی ہے

فریاد اسدؔ بے نگہی ہائے بتاں سے
سچ کہتے ہیں واللہ کہ اللہ غنی ہے

دو جہاں گردشِ یک سجدۂ اسرارِ نیاز
عقدِ صد دل بہ گریبانِ سحر پنہاں ہے

خلوتِ دل میں نہ کر دخل بجز سجدۂ شوق
آستاں میں صفتِ آئینہ در پنہاں ہے

فکرِ پروازِ جنوں ہے سببِ ضبط نہ پوچھ
اشک جوں بیضۂ مژگاں تہِ پر پنہاں ہے

ہوش! اے ہرزہ درا! تہمتِ بیدردی چند؟
نالہ۔ درگرۂ تمنائے اثر پنہاں ہے

وہمِ غفلت۔ مگر احرامِ فسردن باندھے
ورنہ ہر سنگ کے باطن میں شرر پنہاں ہے

وحشتِ دل ہے۔ اسد! عالمِ نیرنگِ نشاط
خندۂ گل بہ لبِ زخمِ جگر پنہاں ہے

مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی۔ ہلاک ہے
موجِ شراب۔ یک مژۂ خوابناک ہے

کلفت طلسمِ جلوۂ کیفیتِ دگر
زنگار خوردہ آئینہ یک برگِ تاک ہے

ہے عرضِ جوہرِ خط و خالِ ہزار عکس
لیکن ہنوز دامنِ آئینہ پاک ہے

ہوں خلوتِ فسردگیِ انتظار میں
وہ بیدماغ جس کو ہوس بھی تپاک ہے

جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد
صحرا ہماری آنکھ میں اک مشتِ خاک ہے

نظر پرستی و بیکاری و خود آرائی
رقیبِ آئینہ ہے حیرتِ تماشائی

تمثالِ تماشا ہا۔ اقبالِ تمنا ہا
دعوائے جنوں باطل۔ تسلیم عبث حائل

بیگانگیِ خوہا۔ موجِ رمِ آہو ہا
پروازِ تپش رنگے۔ گلزارِ ہمہ تنگے

سنگ آمد و سخت آمد درد سرِ خودداری
عجزِ عرقِ شرمے اے آئینہ حیرانی

پروازِ فنا مشکل۔ ہیں عجزِ تن آسانی
دامِ گلۂ الفت۔ زنجیرِ پشیمانی

خوں ہو قفسِ دل میں آ ذوقِ پرافشانی
سندورِ سبکساری۔ مجبورِ گرانجانی

گلزارِ تمنا ہوں۔ گلچینِ تماشا ہوں
صد نالہ اسدؔ بلبل در بندِ زباندانی

گریہ۔ سرشاریِ شوقے بہ بیاباں زدہ ہے
قطرۂ خونِ جگر چشمکِ طوفاں زدہ ہے

گریہ۔ بے لذتِ کاوش۔ نہ کرے جراتِ عشق
قطرۂ اشک۔ ولے بر صفِ مژگاں زدہ ہے

بے تماشا نہیں جمعیتِ چشمِ بسمل
مژہ۔ فالِ دو جہاں خوابِ پریشاں زدہ ہے

فرصتِ آئینہ د پرواز عدم تا ہستی
یک شررِ بالِ دل و دیدہ چراغاں زدہ ہے

درسِ نیرنگ ہے کس موجِ نگاہ؟ یارب!
غنچہ۔ صد آئینہ از انوارِ گلستاں زدہ ہے

سازِ وحشت رقمیہا کہ بہ اظہارِ اسدؔ
دشت و ریگ آئینۂ صفحہ افشاں زدہ ہے

خوابِ غفلت بہ کمینگاہِ نظر پنہاں ہے
شام سائے میں بہ تاراجِ سحر پنہاں ہے

حیرتِ کاغذِ آتش زدہ ہے جلوۂ عمر — تہِ خاکسترِ صد آئینہ پایا ہے مجھے

لالہ و گل بہم آئینۂ اخلاقِ بہار — ہوں میں وہ داغ کہ پھولوں میں بسایا ہے مجھے

دردِ اظہارِ تپش کسوتِ گل معلوم — ہوں میں وہ چاک کہ کانٹوں میں سلایا ہے مجھے

بے دماغِ تپش و عرضِ دو عالم فریاد — ہوں میں وہ خاک کہ ماتم میں اڑایا ہے مجھے

جامِ ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے — کس کا دل ہوں؟ کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

جوشِ فریاد سے لوں گا دیتِ خواب اسدؔ
شوخیِ نغمۂ بیدل نے جگایا ہے مجھے

جنوں رسوائی وارستگی زنجیر بہتر ہے — بقدرِ مصلحت- دلتنگیِ تدبیر بہتر ہے

خوشا خود بینی و تدبیر و غفلت نقدِ اندیشہ — بدیں عجز اگر بدنامیِ تقدیر بہتر ہے

دلِ آگاہ تسکیں خیزِ بیدردی نہ ہو یارب! — نفس- آئینہ دارِ آہِ بے تاثیر بہتر ہے

خدایا! چشم تا دل درد ہے افسونِ آگاہی — نگہ حیرت سوادِ خوابِ بے تعبیر بہتر ہے

درونِ جوہرِ آئینہ- جوں برگِ حنا خوں ہے — بتاں! نقشِ خود آرائی حیا تحریر بہتر ہے

تمنائے اسد- قتلِ رقیب اور شکر کا سجدہ
دعائے دل بہ محرابِ خمِ شمشیر بہتر ہے

دریوزۂ سامانہا- اے بے سروسامانی — ایجادِ گریبانہا- در پردۂ عریانی

چمن میں۔ کچھ نہ چھوڑا تو نے۔ غیر از بیضۂ قمری
عدم میں۔ بہرِ فرقِ سرو مشتِ خاک باقی ہے

گدازِ سعیِ بینش شست و شوئے نقشِ خود کامی
سراپا شبنم آئینِ یک نگاہِ پاک باقی ہے

ہوا ترکِ لباسِ زعفرانی۔ دلکشا۔ لیکن
ہنوز آفت نسب یک عقدہ۔ یعنی چاک باقی ہے

چمن زارِ تمنا ہو گئی صرفِ خزاں لیکن
بہارِ نیم رنگِ آہِ حسرتناک باقی ہے

نہ حیرت چشمِ ساقی کی۔ نہ صحبت دورِ ساغر کی
مری محفل میں غالب۔ گردشِ افلاک باقی ہے

شکلِ طاؤس۔ گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں وہ گل دام۔ کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

پرِ طاؤس تماشا نظر آیا ہے مجھے
ایک دل تھا کہ بصد چشم دکھایا ہے مجھے

عکسِ خط۔ تا سخنِ ناصحِ دانا سرسبز
آئینہ بیضۂ طوطی نظر آیا ہے مجھے

شنبلستانِ جنوں ہوں۔ ستمِ نسبتِ زلف
موکشاں۔ حلقۂ زنجیر میں۔ لایا ہے مجھے

گردباد۔ آئینۂ محشرِ خاکِ مجنوں
ایک بیاباں دلِ بیتاب اٹھایا ہے مجھے

ہے مشقِ وفا جانتے ہیں لغزشِ پا تک
اے شمع! تجھے دعوئ ثابت قدمی ہے

ہے عرضِ شکست - آئینۂ جرأتِ عاشق
جز آہ - کہ سرِ لشکرِ وحشت علمی ہے

واماندۂ ذوقِ طربِ وصل نہیں ہوں
اے حسرتِ بسیار! تمنا کی کمی ہے

وہ پردہ نشیں - اور اسد - آئینۂ اظہار
شہرت چمنِ فتنہ و عنقا ارمی ہے

بسکہ سودائے خیالِ زلف وحشت ناک ہے
تا دلِ شب آبنوسی شانہ آسا چاک ہے

یاں فلاخن بازِ کس کا نالۂ بیباک ہے
جادہ تا کہسار موئے چینیِ افلاک ہے

ہے دو عالم نازِ یک صیدِ شہِ دلدل سوار
یاں خطِ پرکارِ ہستی - حلقۂ فتراک ہے

خلوتِ بال و پرِ قمری میں واکر راہِ شوق
جادۂ گلشن - بہ رنگِ ریشہ زیرِ خاک ہے

عیش گرمِ اضطراب - و - اہلِ غفلت سرد مہر
دورِ ساغر - یک گلستاں - برگریزِ تاک ہے

عرضِ وحشت پر ہے نازِ ناتوانیہائے دل
شعلۂ بے پردہ چینِ دامنِ خاشاک ہے

ہے کمندِ موجِ گل - آشفتہ فتراکی اسد
رنگ - یاں - بوُ سے - سوارِ توسنِ چالاک ہے

مژہ - پہلوے چشم - اے جلوۂ ادراک باقی ہے
ہوا وہ شعلہ داغ - اور شوخیِ خاشاک باقی ہے

یعنی- دماغِ غفلتِ ساقی رسیدہ تر / خمیازۂ خمار سے پیمانہ کھینچئے

پروازِ آشیانۂ عنقائے ناز ہے / بالِ پری بہ وحشتِ بیجا نہ کھینچئے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر / دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچئے

ہے ذوقِ گریہ- عزمِ سفر کیجیے اسدؔ / رختِ جنونِ سیل بہ ویرانہ کھینچئے

دامانِ دل بہ وہمِ تماشا نہ کھینچئے / اے مدعی! خجالتِ بیجا نہ کھینچئے

گل سر بسر اشارۂ جیبِ دریدہ ہے / نازِ بہار- جز بہ تقاضا نہ کھینچئے

حیرت- حجابِ جلوہ- و- وحشت غبارِ راہ / پائے نظر بہ دامنِ صحرا نہ کھینچئے

واماندگی بہانہ- و- دلبستگی فریب / دردِ طلب بہ آبلۂ پا- نہ کھینچئے

گر صفحہ کو نہ دیجیے پروازِ سادگی / جز خطِ عجز- نقشِ تمنا- نہ کھینچئے

خود نامہ بن کے جائیے اُس آشنا کے پاس / کیا فائدہ کہ منتِ بیگانہ کھینچئے

دیدارِ دوستاں لباسی ہے ناگوار / صورت بہ کارخانۂ دیبا- نہ کھینچئے

ہے بے خمار- نشۂ خونِ جگر اسدؔ / دستِ ہوس بہ گردنِ مینا نہ کھینچئے

زلفِ سیہ افعی نظرِ بد قلمی ہے / ہر چند خطِ سبز و زمرد رقمی ہے

شرم۔ طوفانِ خزاں۔ رنگ طرب گاہِ بہار
گلِ مہتاب بہ کفِ چشمِ تماشائی ہے
باغِ خاموشیِ دل سے سخنِ عشق اسدؔ
نفسِ سوختہ رمزِ چمن ایمائی ہے

نوائے خفتۂ الفت اگر بیتاب ہو جاوے
پرِ پروانہ۔ تارِ شمع پر مضراب ہو جاوے

اگر وحشت۔ عرق افشانِ بے پروائیِ حسن
بیاضِ دیدۂ آہو کفِ سیلاب ہو جاوے

زبس طوفانِ آبِ گل ہے غافل کیا تعجب ہے
کہ ہر یک گرد بادِ گلستاں گرداب ہو جاوے

اثر میں یاں تلک بے دستِ دعا عجز پیدا کر
کہ سجدہ قبضۂ تیغِ خمِ محراب ہو جاوے

بہ رنگِ گل اگر شیرازہ بندِ بیخودی رہیے
ہزار آشفتگی مجموعۂ یک خواب ہو جاوے

اسدؔ با وصفِ عجز بے تکلف خاک گردیدن
غضب ہے گر غبارِ خاطرِ احباب ہو جاوے

تا چند نازِ مسجد و بتخانہ کھینچیے
جوں شمع۔ دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے

بہزاد نقشِ یک دلِ صد چاک عرض کر
گر زلفِ یار کھینچ نہ سکے۔ شانہ کھینچیے

راحت کمینِ شوخیِ تقریبِ نالہ ہے
پائے نظر بہ دامنِ افسانہ کھینچیے

زلفِ پری بہ سلسلۂ آرزو رسا
یک عمر دامنِ دلِ دیوانہ کھینچیے

دامنِ گردوں میں رہ جاتا ہے ہنگامِ وداع
گوہرِ شب تاب اشکِ دیدۂ خورشید ہے

رتبۂ تسلیمِ خلقت مشرباں عالی سمجھ
چشمِ قربانی۔ گلِ شاخِ ہلالِ عید ہے

کچھ نہیں حاصل تعلق میں بغیر از کشمکش
اے خوشا رندی! اگر یغِ گلشنِ تجرید ہے

کثرتِ اندوہ سے حیران و مضطر ہے اسدؔ
یا علی! او وقتِ عنایات و دمِ تائید ہے

فرصت۔ آئینۂ صد رنگِ خود آرائی ہے
روز و شب۔ یک کفِ افسوسِ تماشائی ہے

وحشتِ زخمِ وفا دیکھ۔ کہ سر تا سرِ دل
بخیہ۔ جوں جوہرِ تیغ۔ آفت گیرائی ہے

شمع آسا۔ چہ سرِ دعویٰ کو پائے ثبات؟
گلِ صد شعلہ۔ بہ یک جیبِ شکیبائی ہے

نالہ۔ خونیں ورق۔ و۔ دل۔ گلِ مضمونِ شفق
چمن آرائے نفس۔ وحشتِ تنہائی ہے

بوئے گل۔ فتنۂ بیدار و چمن۔ جامۂ خواب
وصل بر رنگِ تپش کسوتِ رسوائی ہے

ہے سوادِ خطِ پریشاں موئے اہلِ عزا
خامہ میرا شمعِ قبرِ کشتگاں کا دودہ ہے

جس طرف سے آئے ہیں۔ آخر اُدھر ہی جائینگے
مرگ سے وحشت نہ کر۔ راہِ عدم پیمودہ ہے

پنبۂ مینائی ہی رکھو تم اپنے کان میں
مے پرستاں! ناصحِ بیصرفہ گو۔ بیہودہ ہے

کثرتِ انشائے مضمونِ تحیر سے۔ اسد
ہر سرِ انگشت۔ نوکِ خامۂ فرسودہ ہے

بہرِ پروردن۔ سراسر لطف گستر سایہ ہے
پنجۂ مژگاں۔ بطفلِ اشک دستِ دایہ ہے

فصلِ گل میں دیدۂ خونیں نگاہانِ جنوں
دولتِ نظارۂ گل ہم شفق سرمایہ ہے

شورشِ باطن سے یاں تک مجھکو غفلت ہے کہ آہ
شیونِ دل یک سرودِ خانہ ہمسایہ ہے

کیوں نہ تیغِ یار کو مشاطۂ الفت کہوں؟
زخمِ مثلِ گل سراپا کے مرے پیرایہ ہے

اے اسد! آباد ہے مجھ سے جہانِ شاعری
خامہ میرا تختِ سلطانِ سخن کا پایہ ہے

چشمِ گریاں بسملِ شوقِ بہارِ دید ہے
اشک ریزی عرضِ بال افشانیٔ امید ہے

عیاں ہے پائے حنائی سے پرتوِ خورشید
رکاب۔ روزنِ دیوارِ خانۂ زیں ہے

جبینِ صبحِ امیدِ فسانہ گویاں پر
درازئ رگِ خوابِ بتاں خطِ چیں ہے

ہوا نشانِ سوادِ دیارِ حسن۔ عیاں
کہ خطِ غبارِ زمیں خیزِ زلفِ مشکیں ہے

بجا ہے گر نہ سنے۔ نالہ ہائے بلبلِ زار
کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

جوہرِ آئینہ ساں۔ مژگاں بہ دل آسودہ ہے
قطرہ جو آنکھوں سے ٹپکا۔ سو نگاہ آلودہ ہے

دامگاہِ عجز میں سامانِ آسائش کہاں
پرفشانی بھی فریبِ خاطرِ آسودہ ہے

اے ہوس! عرضِ بساطِ نازِ مشتاقی نہ مانگ
جوں پرِ طاؤس۔ چندیں داغِ رشک اندودہ ہے

ہے ریا کا رتبہ بالاتر تصور کردنی
تیرگی سے داغ کی۔ سیم مس اندودہ ہے

کیا کہوں پروازگی آوارگی کی کشمکش
عافیت۔ سرمایۂ بال و پرِ نکشودہ ہے

بہ رہنِ ضبط ہے آئینہ بندیٔ گوہر — وگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشمِ پرنم ہے

چمن میں کون ہے۔ طرز آفرینِ شیوۂ عشق — کہ گل ہے بلبلِ رنگین و بیضہ شبنم ہے

اگر نہ ہووے رگِ خواب صرفِ شیرازہ — تمام دفترِ ربطِ مزاج برہم ہے

اسد۔ بہ نازکیٔ طبعِ آرزو۔ انصاف — کہ ایک وہمِ ضعیف و غمِ دو عالم ہے

عذارِ یار نظر بندِ چشمِ گریاں ہے — عجب کہ پرتوِ خور شمعِ شبنمستاں ہے

زباں بہ کامِ خموشاں ز فرطِ تلخیٔ ضبط — بہ رنگِ پستہ۔ بہ زہر آبِ دو پیکاں ہے

قبائے جلوہ فزائے لباسِ عریانی — بہ طرزِ گل۔ رگِ جاں مجھ کو تارِ داماں ہے

لبِ گزیدۂ معشوق ہے دلِ افگار — نشانِ تیزیٔ شمشیر زخمِ خنداں ہے

کشودِ غنچۂ دل ہا عجب نہ رکھ۔ غافل — صبا خرامیٔ خوباں۔ بہار ساماں ہے

فغاں! کہ بہر شفائے حصولِ ناشدنی — دماغ۔ نازکشِ منتِ طبیباں ہے

اسد! جہاں کہ علی برسرِ نوازش ہو — کشادِ عقدۂ دشوار۔ کارِ آساں ہے

شفق بہ دعوئ عاشق۔ گواہِ رنگیں ہے — کہ ماہ دزدِ حنائے کفِ نگاریں ہے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ — خطِ پیالہ۔ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

گر دکھاؤں صفحۂ بے نقشِ رنگِ رفتہ کو
دستِ رد سطرِ تبسم یک قلم انشا کرے

جوشِ اندازِ شہیدانِ نفس دزدیدہ ہو
نوحۂ ماتم بہ آوازِ پرِ عنقا کرے

صفحۂ گرداب جوہر کو بنا ڈالے تنور
عکس گر طوفانیِ آئینۂ دریا کرے

یک درِ بر روے رحمت بستہ و در شش جہت
ناامیدی ہے خیالِ خانہ ویراں کیا کرے

[1] توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

ناتوانی سے نہیں سر در گریبانی اسدؔ
ہوں سراپا یک قلم تسلیم جو مولا کرے

بہارِ تعزیت آبادِ عشق ماتم ہے	کہ تیغِ یار ہلالِ مہِ محرم ہے

[1] یہ شعر حاشیے پر بڑھایا گیا ہے۔ اور اس کا متن اور قریب القلم ہونا خود ہی کہہ رہا ہے کہ یہ بعد کا کہا ہوا ہے۔ غالب نے اپنے بعض خطوں میں بھی یہ شعر لکھا ہے۔

صبحدم وہ جلوہ ریزِ بے نقابی ہو اگر
رنگِ رخسارِ گلِ خورشید مہتابی کرے

زخمہائے کہنۂ دل رکھتے ہیں جوں مرگی
اے خوشا گر آبِ تیغِ ناز تیزابی کرے

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو۔ غالب تو پھر
کیوں نہ دلی میں۔ ہر اک ناچیز نوابی کرے

صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے
غافلاں! آغازِ کار۔ آئینۂ انجام ہے

بسکہ ہیں صیاد۔ راہِ عشق میں۔ صرفِ کمیں
جادۂ رہ۔ بے مژگانِ چشمِ دام ہے

بسکہ تیرے جلوۂ دیدار کا ہے اشتیاق
ہر بتِ خورشید طلعت آفتابِ بام ہے

مستعدِ قتلِ یک عالم ہے جلادِ فلک
کہکشاں موجِ شفق میں تیغِ خوں آشام ہے

کیا کمالِ عشق نقص آبادِ گیتی میں۔ ملے
پختگی ہائے تصور یاں۔ خیالِ خام ہے

ہو جہاں وہ ساقیِ خورشید رو مجلس فروز
واں اسد!۔ تارِ شعاعِ مہر خطِ جام ہے

اے خوشا وقتے! کہ ساقی یک خمستاں وا کرے
تار و پودِ فرشِ محفل پنبۂ مینا کرے
گر تپِ آسودۂ مژگاں تصرف وا کرے
رشتۂ یا شوخیِ بالِ نفس پیدا کرے

ساقیا دے ایک ہی ساغر میں سب کو مرے آج
آرزوئے بوسۂ لبہائے میگوں ہے مجھے

ہو گئی باہم گر۔ جوشِ پریشانی سے جمع
گردشِ جامِ تمنا دورِ گردوں ہے مجھے

دیکھ لے جوشِ جوانی کی ترقی بھی کہ اب
بدر کی مانند کاہش روز افزوں ہے مجھے

غنچگی ہے بر نفسِ چیدنِ فکر اے اسد
ور شگفتن ہائے دل در رہنِ مضموں ہے مجھے

ولا۔ عبث ہے تمنائے خاطر افروزی
کہ بوسۂ لبِ شیریں ہے اور گلو سوزی

طلسمِ آئینۂ زانوئے فکر ہے غافل
ہنوز حسن کو ہے سعیِ جلوہ اندوزی

ہوئی ہے سوزشِ دل بسکہ داغ بے اثری
اگی ہے دودِ جگر سے شبِ سیہ روزی

بہ پر فشانیِ پروانۂ چراغِ مزار
کہ بعدِ مرگ بھی ہے لذتِ جگر سوزی

تپش تو کیا۔ نہ ہوئی مشقِ پر فشانی بھی
رہا میں ضعف سے۔ شرمندۂ نو آموزی

اسد۔ ہمیشہ پئے کفش ہائے سیم تناں
شعاعِ مہر سے کرتا ہے چرخ۔ زردوزی

محو آرامیدگی سامانِ بیتابی کرے
چشم میں توڑے نمکداں۔ تا شکر خوابی کرے

آرزوئے خانہ آبادی نے ویراں تر کیا
کیا کروں۔ گر سایۂ دیوار سیلابی کرے

نغمہا وابستۂ یک عقدۂ تارِ نفس
ناخنِ تیغِ بتاں۔ شاید کہ مضرابی کرے

جنوں فسردۂ تمکیں ہے۔ کاش عہدِ وفا
گدازِ حوصلہ کو پاسِ آبرو جانے

نہ ہووے کیونکہ۔ اسے فرضِ قتلِ اہلِ وفا
لہو میں ہاتھ کے بھرنے کو۔ جو وضو جانے

زباں سے عرضِ تمنائے خامشی معلوم
مگر۔ وہ خانہ براندازِ گفتگو جانے

مسیحِ کشتۂ الفت ببر علی خاں ہے
کہ جو۔ اسدؔ تپشِ نبضِ آرزو جانے

دیکھ۔ تری خوئے گرم۔ دل بہ تپش رام ہے
طائرِ سیماب کو شعلہ رگِ دام ہے

شوخیٔ چشمِ حبیب۔ فتنۂ ایام ہے
قسمتِ بختِ رقیب گردشِ صد جام ہے

جلوۂ بینش پناہ۔ بخشش بے ذوقِ نگاہ
کعبۂ پوشش سیاہ مردمک احرام ہے

کو نفس۔ و چہ غبار؟ جرأتِ عجز آشکار
ور تپش آبادِ شوق۔ سرمہ صدا نام ہے

غفلتِ افسردگی تہمتِ تمکیں نہ ہو
اے ہمہ خوابِ گراں حوصلہ بدنام ہے

بزمِ وداعِ نظر یاسِ طرب نامہ بر
فرصتِ رقصِ شرر بوسہ بہ پیغام ہے

گریۂ طوفاں رکاب۔ نالۂ محشر عناں
بے سر و ساماں اسدؔ فتنہ سرانجام ہے

کاوشِ دزدِ حنا پوشیدہ افسوں ہے مجھے
ناخنِ انگشتِ خوباں لعلِ واژوں ہے مجھے

ریشۂ شہرت دوانیدن ہے فتن زیرِ خاک
خنجرِ جلاد برگِ بیدِ مجنوں ہے مجھے

اسدؔ وارستگاں باوصفِ ساماں بے تعلق ہیں
صنوبر گلستاں میں بادلِ آزادہ آتا ہے

بہ فکرِ حیرت رم آئینہ پرداز زانو ہے
کہ مشکِ نافہ تمثالِ سوادِ چشمِ آہو ہے

ترحم میں ستم کوشاں کے ہے سامانِ خونریزی
سرشکِ چشمِ یار آب دمِ شمشیر ابرو ہے

کرے ہے دستِ فرسودِ ہوس وہمِ توانائی
پرِ افشاندہ در کنجِ قفس تعویذِ بازو ہے

ہوا چرخِ خمیدہ ناتواں بارِ علائق سے
کہ ظاہر پنجۂ خورشید دستِ زیرِ پہلو ہے

اسدؔ تا کے طبیعت طاقتِ ضبطِ الم لائے
فغانِ دل بہ پہلو نالۂ بیمارِ بدخو ہے

خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

قفس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشکِ عدو
زیادہ اس سے گرفتار ہوں کہ تو جانے

ز کسوتِ عرقِ شرم قطرہ زن ہے خیال
مباد حوصلہ معذورِ جستجو جانے

شہِ گل نے کیا جب بندوبستِ گلشن آرائی
عصائے سبزہ۔ نرگس کو دی خدمت نظارت کی

نہیں ریزشِ عرق کی۔ ابا سے ذوبانِ اعضا ہے
تپِ خجلت نے کیا نبضِ رگِ گل میں حرارت کی

زبس نکلا غبارِ دل۔ بوقتِ گریہ آنکھوں سے
اسدؔ کھائے ہوئے سرمے ز آنکھوں نے بصارت کی

خدایا! دل کہاں تک دن بصد رنج و تعب کاٹے
خمِ گیسو و شمشیرِ سیاب۔ اور شب کاٹے

کریں گر قدرِ اشکِ دیدۂ عاشق خود آرایاں
صدف دندانِ گوہر سے بہ حسرت اپنے لب کاٹے

دریغا وہ مریضِ غم۔ کہ فرطِ ناتوانی سے
بہ قدرِ یک نفس جادہ۔ بہ صد رنج و تعب کاٹے

یقیں ہے آدمی کو دستگاہِ فقر حاصل ہو
دمِ تیغِ توکل سے اگر پائے سبب کاٹے

اسدؔ مجھ میں ہے اُسکے بوسۂ پا کی کہاں جرأت
کہ میں نے دست و پا باہم بہ شمشیرِ ادب کاٹے

ہوا جب حسن کم۔ خط بر عذارِ سادہ آتا ہے
کہ بعد از صاف۔ دُرد ساغر میں فرو بادہ آتا ہے

نہیں ہے مزرعِ الفت میں حاصل غیرِ پامالی
نظر دانہ سرِشکِ بر زمیں افتادہ آتا ہے

محیطِ دہر میں بالیدن از ہستی گزشتن ہے
کہ یاں ہر اک حباب آسا شکست آمادہ آتا ہے

دیارِ عشق میں جاتا ہے جو سوداگری ساماں
متاعِ زندگانی کا۔ بہ غارت دادہ آتا ہے

ل یہ شعر متن میں نہ تھا بعد میں حاشیے پر بڑھا کر غزل کو پورا کیا گیا ہے۔

رخسارِ یار کی جو ہوئی جلوہ گستری — زلفِ سیاہ بھی شبِ مہتاب ہو گئی

بیدادِ انتظار کی طاقت نہ لاسکی — اے جانِ برلب آمدہ بیتاب ہو گئی

غالب۔ زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی

ہر رنگِ سوز۔ پردۂ یک ساز ہے مجھے — بالِ سمندر۔ آئینۂ ناز ہے مجھے

طاؤسِ خاک حسنِ نظر باز ہے مجھے — ہر ذرہ چشمکِ نگہِ ناز ہے مجھے

آغوشِ گل ہے آئینۂ ذرہ ذرہ خاک — عرضِ بہار جوہرِ پرواز ہے مجھے

ہے بوئے گل غریبِ تسلی گہِ وطن — ہر جزوِ آشیاں پرِ پرواز ہے مجھے

ہے جلوۂ خیال سویدائے مردمک — جوں داغِ شعلہ سرخطِ آغاز ہے مجھے

وحشت بہارِ نشہ و گل ساغرِ شراب — چشمِ پری شفقکدۂ راز ہے مجھے

فکرِ سخن بہانۂ پروازِ خامشی — دودِ چراغ سرمۂ آواز ہے مجھے

ہے خامہ فیضِ بیعتِ بیدل بکف۔ اسد
یک نیستاں قلمروِ اعجاز ہے مجھے

نگاہِ یار نے جب عرضِ تکلیفِ شرارت کی — دیا ابرو کو چھیڑا۔ اور اس نے فتنے کو اشارت کی

روانی موجِ مے کی گر خطِ جام آشنا ہوے — لکھے کیفیت اس طرزِ تبسم کی عبارت کی

صد سر تا ناخنِ پا رزقِ یک شبگیر ہے

آب ہو جاتے ہیں بہ رنگِ ہمتِ باطل ہمہ مرد

اشک پیدا کر اسدؔ گر آہ بے تاثیر ہے

یہ سرنوشت میں میری ہے اشک افشانی

کہ موجِ آب ہے ہر ایک چینِ پیشانی

جنونِ وحشتِ ہستی یہ عام ہے کہ بہار

رکھے ہے کسوتِ طاؤس میں پرافشانی

لبِ نگار میں آئینہ دیکھ آبِ حیات

بہ گمرہیِ سکندر ہے محوِ حیرانی

نظر بہ غفلتِ اہلِ جہاں ہوا ظاہر

کہ عیدِ خلق یہ حیراں ہے چشم[1] قربانی

کہوں وہ مصرعِ برجستہ جو بقامت ہیں

کہ سرو ہو نہ سکے انکا مصرعِ ثانی

اسدؔ نے کثرتِ دلہائے خلق سے جانا

کہ زلفِ یار ہے مجموعۂ پریشانی

بجوز بسکہ خاطرِ بیتاب ہو گئی

مژگاں بازماندہ رگِ خواب ہو گئی

موجِ تبسمِ لبِ آلودہ سی

میرے لئے تو تیغِ سیہ تاب ہو گئی

---

[1] قلمی نسخے میں اس مصرع کا کوئی لفظ بہ سہوِ کاتب رہ گیا ہے۔ کیونکہ متن میں یہ مصرع یوں درج ہے

"کہ عیدِ خلق یہ حیراں ہے قربانی"

جو کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا ہے۔ میں نے جسارت کر کے ایک لفظ "چشم" بڑھا دیا ہے۔
اربابِ نظر اس جرأت کو معاف فرما کر خود تصحیح فرمالیں۔

ریزشِ خونِ وفا ہے جرمِ نوشیدائے یار
یاں گلوئے شیشۂ مے قبضۂ شمشیر ہے
جو بہ شامِ غم چراغِ خلوتِ دل تھا اسد
وصل میں۔ وہ۔ سوزِ شمعِ مجلسِ تقریب ہے

ذوقِ بے پروا خرابِ وحشتِ تسخیر ہے
آئینہ خانہ مری تمثال کو زنجیر ہے
ذرہ دے مجنوں کے گرد باغ کو وسعت اد
ہر بیاباں۔ یک بیاباں حسرتِ تعمیر ہے
میکشِ مضموں کو حسنِ ربطِ خط کیا چاہیے
لغزشِ رفتارِ خامہ مستیٔ تحریر ہے
خانمانِ جبریانِ غفلتِ معنی خراب
جب ہوئے ہم بے گنہ۔ رحمت کی کیا تقصیر ہے
چاہیے گر جنت۔ جز آدم وارثِ آدم نہیں
شوخیٔ ایمانِ زاہد سستیٔ تدبیر ہے
شب دراز۔ و۔ آتشِ دل تیز۔ یعنی مثلِ شمع

گردش میں لا تجلّیِ صد ساغرِ تسلی
یک برگِ بے نوائی۔ صد عوضِ نیستاں
اے غنچۂ تمنا! یعنی کفِ نگاریں

چشمِ تحیّر آغوش۔ مخمورِ ہر ادا ہے
طوفانِ نالۂ دل۔ تا موجِ بوریا ہے
دل دے تو ہم بتا دیں مٹھی میں تیری کیا ہے

ہر نالہ اسد ہے مضمونِ داد خواہی
یعنی سخن کو کاغذ۔ احرامِ مدعا ہے

ضبط سے جوں مردمک اسپند قامت گیر ہے
مجمرِ بزمِ فردوں دیدۂ نخچیر ہے

آشیاں بندِ بہارِ عیش ہوں ہنگامِ قتل
یاں پرِ پروازِ رنگِ رفتہ۔ بالِ تیر ہے

ہے جہاں فکرِ کشیدن ہائے نقشِ روئے یار
ماہتابِ ہالہ پیرا۔ گردۂ تصویر ہے

وقتِ حسن افروزیِ زینت طرازاں جائے گُل
از نہالِ شمع۔ پیدا غنچۂ گلگیر ہے

گریہ سے بندِ محبت میں ہوئی نام آوری
لخت لختِ دل نگینِ خانۂ زنجیر ہے

ربطِ تمیزِ اعیاں۔ دُردِ مے صدا ہے
اعمیٰ کو سرمۂ چشم آوازِ آشنا ہے

موئے دماغِ وحشت۔ سر رشتۂ فنا ہے
شیرازۂ دو عالم۔ یک آہِ نارسا ہے

دیوانگی ہے تجھکو۔ درسِ خرامِ دنیا
موجِ بہار یکسر۔ زنجیرِ نقشِ پا ہے

پروانے سے ہو شاید۔ تسکینِ شعلۂ شمع
آسائشِ وفا ہا۔ بیتابیِ جفا ہے

اے اضطرابِ سرکش! یک سجدہ وار تمکیں
میں بھی ہوں شمعِ کشتہ۔ گر داغ خونبہا ہے

نے حسرتِ تسلی۔ نے ذوقِ بیقراری
یک درد و صد دوا ہے یک دست صد دعا ہے

دریائے مے ہے ساقی لیکن خمار باقی
تا کو چہ دادنِ موج۔ خمیازہ آشنا ہے

وحشت نہ کھینچ قاتل! حیرت نفس ہے بسمل
جب نالہ خوں ہو غافل تاثیر کیا بلا ہے

بتخانے میں اسدؔ بھی بندہ تھا۔ گاہ گاہے
حضرت چلے حرم کو اب آپ کا خدا ہے

گریاں سرِ نہ کھینچے۔ تنگی عجب فضا ہے
وسعت گہِ تمنا۔ یک دام و صد ہوا ہے

یہ ہمزبانِ دو عالم تکلیفِ یک صدا ہے
مینا شکستگاں کو کہسار خونبہا ہے

فکرِ سخن یک انشائے ندانی خموشی
دودِ چراغ۔ گویا۔ زنجیرِ بے صدا ہے

سوزِ نیِ دو عالم۔ قربانِ سازِ یک درد
مصراعِ نالۂ نے سکتہ ہزار جا ہے

درسِ خرام تا کے۔ خمیازۂ روانی
اس موجِ مے کو غافل پیمانۂ نقشِ پا ہے

حسرت آبادِ جہاں میں ہے الم غم آفریں
نوحہ- گویا- خانہ زادِ نالۂ رنجور ہے

کیا کروں غمہائے پنہاں لے گئے صبر و قرار
دزد گر ہو خانگی- تو پاسباں مجبور ہے

ہے زپا افتادگی ہی نشۂ بیجائی مجھے
بے سخن- تبخالۂ لب- دانۂ انگور ہے

آگ[1] سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں- نالے سے مجبور ہے

جس جگہ ہو مسند آرا جانشینِ مصطفےٰ
اس جگہ تختِ سلیماں نقشِ پائے مور ہے

ہے وہاں تکلیف عرض بے دماغی اور اسد
یاں صریرِ خامہ مجھکو- نالۂ رنجور ہے

اے خیالِ وصل نادر ہے مے آشامی تری
پختگی ہائے کبابِ دل ہوئی خامی تری

پچ گیا جوشِ صفائے زلف کا اعضا میں عکس
ہے نزاکت جلوہ- اے ظالم سیہ فامی تری

برگ ریزی ہائے گل ہے وضعِ زر افشاندنی
باج لیتی ہے گلستاں سے گل اندامی تری

بسکہ ہے عبرت- ادب یاوہ گیہائی ہوس
میرے کام آئی- دلِ مایوس ناکامی تری

ہمنشینیِ رقیباں- گرچہ ہے سامانِ رشک
لیکن اس سے ناگوارا تر ہے بدنامی تری

سر بزانوئے کرم رکھتی ہے شرمِ ناکسی
اے اسد بیجا نہیں ہے غفلت آرامی تری

[1] یاد رہے اس سے قبل کا شعر حاشیے پر بعد میں بڑھائے گئے ہیں مطبوعہ دیوان میں اس شعر کا قافیہ مجبور کی بجائے لاعلاج ہو ملاحظہ ہو [illegible]

جنوں کو سخت بیتابی ہے تکلیفِ شکیبائی
جنونِ بیکسی ساغر کش داغِ پلنگ آیا
ثمر کیفیتِ سے سنگ عرضِ ناز بینائی
خراباتِ جنوں میں ہے اسدؔ وقتِ قدح نوشی
بعشقِ ساقیِ کوثر بہارِ بادہ پیمائی

بسکہ زیرِ خاک ۔ با آبِ طراوت راہ ہے
عکسِ گلہائے سمن سے چشمہ ہائے باغ میں
واں سے ہے تکلیفِ عرضِ بیدماغیہائے دل
حسن و رعنائی میں وہم صد سرو گردن فرق

ریشہ ہے ہر تخم کا نمو اندرونِ چاہ ہے
فلسِ ماہی آئینہ پردازِ داغِ ماہ ہے
یاں صریرِ خامہ مجھکو نالۂ جانکاہ ہے
سرو کی قامت پہ گل یک دامنِ کوتاہ ہے

رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر اسدؔ
پیچ و تابِ دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

بسکہ چشم از انتظارِ خوش خطاں بے نور ہے
بزمِ خوباں بسکہ ۔ جوشِ جلوہ سے پُرنور ہے
ہوں تصورہائے ہمدوشی سے بدستِ شرم
ہے عجب مردوں کو غفلتہائے اہلِ قہر سے

یک قلم شاخِ گلِ نرگس عصائے کور ہے
پشتِ دستِ عجز یاں ہر برگِ نخلِ طور ہے
حیرتِ آغوشِ خوباں ساغرِ بلور ہے
سبزہ جوں انگشتِ حیرت دردہانِ گور ہے

شکستِ قیمتِ دل آئنۂ عذرِ شناسائی
طلسمِ نا امیدی ہے خجالت گاہِ پیدائی
تحیّر ہے گریباں گیرِ ذوقِ جلوہ پیرائی
ملی ہے جوہرِ آئینہ کو۔ جوں بخیہ گیرائی
پرِ طاؤس ہے نیرنگِ داغِ حیرت انشائی
دو عالم دیدۂ بسمل چراغاں جلوہ پیمائی
شرارِ سنگ سے۔ پا در حنا۔ گلگونِ شیریں ہے
ہنوز اے تیشۂ فرہاد! عرضِ آتشیں پائی
غرورِ دستِ ردّ نے شانہ توڑا۔ فرقِ ہدہد پہ
سلیمانی ہے ننگِ بیدماغانِ خود آرائی
جنوں افسردہ و جاں ناتواں۔ اے جلوۂ شوخی کر
گئی یک عمرِ خود داری بہ استقبالِ رعنائی
نگاہِ عبرت افسوں۔ گاہ برق و گاہ مشعل ہے
ہوا ہر خلوت و جلوت سے حاصل ذوقِ تنہائی
خدایا۔ خوں ہو رنگِ امتیاز اور نالہ موزوں ہو

آج تنخواہِ شکستن ہے کلہ جبریل کی
مدعا در پردہ۔ یعنی جو کہوں باطل سمجھ
وہ فرنگی زادہ کھاتا ہے قسم انجیل کی
خیر خواہ دیہ ہوں۔ از بہرِ دفعِ چشمِ زخم
کھینچتا ہوں اپنی آنکھوں میں سلائی نیل کی
نالہ کھینچا ہے سراپا داغِ جرات ہوں اسدؔ
کیا سزا ہے میرے جرمِ آرزو تاویل کی

کیا ہے ترکِ دنیا۔ کاہلی سے
خراجِ دیہہِ ویراں۔ یک کفِ خاک
پریشاں ہو گئے شعلے ہزاروں
خدا۔ یعنی پدر سے مہرباں تر

ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے
بیاباں خوش ہوں تیری عاملی سے
رہے ہم داغ۔ اپنی کاہلی سے
پھرے ہم دربدر ناقابلی سے

اسدؔ قربانِ لطفِ جورِ بیدل
خبر لیتے ہیں۔ لیکن بیدلی سے

نگاہ اس چشم کی افزوں کرے ہے ناتوانائی
پرِ بالش ہے وقتِ دیدِ مژگانِ تماشائی

سررشتۂ بیتابئ دل در گرہ عجز		پرواز بہ خوں خفتہ و فریاد رسا ہے
اے پرتو خورشید جہاں تاب ادھر بھی	م	سایے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ	م	تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے
بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب	م	کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے
شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی	مطبو	جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے
تو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو		معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب۔ اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

(۳)

سے پھونکتا ہے نالہ۔ ہر شب۔ صورِ اسرافیل کی
ہم کو جلدی ہے مگر تو نے قیامت ڈھیل کی

کی ہیں کس پانی سے یاں یعقوب نے آنکھیں سفید
ہے جو آبی پیرہن ہر موج رودِ نیل کی

عرش پر تیرے قدم سے ہے۔ دماغِ گردِ راہ

سے یہ وہ غزلیں ہیں جن کا ہم طرح کوئی شعر مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں۔

یارب! ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو
یہ محشرِ خیال - کہ دنیا کہیں جسے

سرپر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
م وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
م شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

غالب - برا نہ مان جو واعظ برا کہے
م ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

شبنم بہ گلِ لالہ - نہ خالی ز ادا ہے	مخ	داغِ دلِ بیدرد - نظرگاہِ حیا ہے
دل خوں شدۂ کشمکشِ کثرتِ اظہار دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار	م	آئینہ بدستِ بتِ بدستِ حنا ہے
تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق	م	آئینہ بہ اندازِ گل آغوش کشا ہے
قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ	م	اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے
مجبوری دعوائے گرفتاریِ الفت	م	دامن تہِ سنگ آمدہ احرامِ وفا ہے دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

اسد کو حسرتِ عرضِ نیاز تھی دمِ قتل ہنوز یک سخنِ بے صدا نکلتی ہے

قلمی

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
م ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ہے انتظار سے شرر آبادِ رستخیز
مژگانِ کوہکن۔ رگِ خارا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
م گلدستۂ نگاہ۔ سویدا کہیں جسے

کس فرصتِ وصال پہ ہے۔ گل کو۔ عندلیب!
زخمِ فراق۔ خندۂ بیجا کہیں جسے

ہے تار و پودِ فرشِ تبسم بہ بزمِ عیش
م درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا!
م افسونِ انتظارِ تمنا کہیں جسے

سودائی خیال ہے طوفانِ رنگ و بو		یاں ہے کہ داغِ لالہ دماغِ بہار ہے
بھونچال میں گرا تھا یہ آئینہ طاق سے		حیرت شہیدِ جنبشِ ابروئے یار ہے
حیراں ہوں شوخیِ رگِ یاقوت دیکھ کر		یاں ہے کہ صحبتِ خس آتش برار ہے
اے عندلیب۔ یک کفِ خس بہرِ آشیاں	م	طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
غفلت کفیلِ عمر و اسد ضامنِ وفا غفلت کفیلِ عمر و اسد ضامنِ نشاط	م	اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے
دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ	مطبوعہ	نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

پچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے۔ پہ یاں انتظار ہے

خوشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے	قلمی	نگاہ دل سے تری سرمہ سا نکلتی ہے
بہ حلقۂ خمِ گیسوے راستی آموز		دہانِ مارے گویا صبا نکلتی ہے
برنگِ شیشہ ہوں یک گوشۂ دلِ خالی		کبھی پری مری خلوت میں آ نکلتی ہے
فشارِ تنگیِ صحبت سے آتی ہے شبنم	م	صبا جو غنچہ کی خلوت میں جا نکلتی ہے
فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم		صبا جو غنچہ کے پردے میں جا نکلتی ہے
نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ	م	کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

خیمۂ لیلیٰ سیاہ۔ و خانۂ مجنوں خراب		جوشِ ویرانی ہے عشقِ داغ بیرون دادہ ہے

بزم ہستی وہ تماشا ہے کہ جس کو ہم اسدؔ
دیکھتے ہیں چشم از خوابِ عدم نکشادہ ہے

منت کشی میں حوصلہ بے اختیار ہے	قلمی	دامانِ صد کفن۔ تہِ سنگِ مزار ہے
عبرت طلب ہے حلِ معمائے آگہی		شبنم گدازِ آئینۂ اعتبار۔ ہے
ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جائے غبارِ شوق	م	گردام یہ ہے۔ وسعتِ صحرا شکار ہے
خجلت کشِ وفا کو شکایت نہ چاہیے		اے مدعی! طلسمِ عرق بے غبار ہے
کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو۔ اے خدا	م	آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے
چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب	م	اے عندلیب۔ وقتِ وداعِ بہار ہے

کیفیتِ ہجومِ تمنا رسا اسدؔ
خمیازہ۔ ساغرِ رنجِ خمار ہے

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے	قلمی	نافہ۔ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے
دل مت گنوا۔ خبر نہ سہی۔ سیر ہی سہی	م	اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے
زنجیر یاد پڑتی ہے۔ جادے کو دیکھ کر		اس چشم سے ہنوز نگہ یادگار ہے
بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر	م	ہر ذرے کے نقاب میں دل بیقرار ہے

غم و عشرت قدم بوسِ دلِ تسلیم آئیں ہے	نی	دعائے مدعا گم کردگانِ عشق آمیں ہے
تماشا ہے کہ ناموسِ وفا رسوائے آئیں ہے		نفس تیری گلی میں خوں ہو او بارنگیں ہے
لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی	م	قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے
ہمارا دیکھنا گر ننگ ہے سیرِ گلستاں کر		شرارِ آہ سے موجِ صبا دامانِ گلچیں ہے
پیامِ تعزیت پیدا ہے اندازِ عیادت سے		شبِ ماتم تہِ دامانِ دودِ شمع بالیں ہے
زبس جزِ حسن منت ناگوارا ہے طبیعت پر		کشادِ عقدہ محوِ ناخنِ دستِ نگاریں ہے
نہیں ہے سرنوشتِ عشق غیر از دیدِ ما غیبہا		جبیں پر میری تہِ خامۂ قدرت خطِ چیں ہے
بہارِ باغ پامالِ خرامِ جلوہ فرمایاں		حنائے دست و خونِ کشتگاں کی تیغ رنگیں ہے

بیابانِ فنا ہے بعدِ صحرائے طلب غالبؔ
پسینہ توسنِ ہمت کا سیلِ خانۂ زیں ہے

دیکھتا ہوں وحشتِ شوقِ خروش آمادہ سے	نی	فالِ رسوائی سرشکِ سربصحرا دادہ سے
دام گر سبزے میں پنہاں کیجیے طاؤس ہو		جوشِ نیرنگِ بہارِ عرضِ صحرادادہ سے
پا بہ تراب سیلِ طوفانِ صدائے آب ہے آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے	م	نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے
بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا	م	شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

اے ہوس مبارک ہو کارِ عشق آساں ہے
کارگاہِ ہستی میں۔ لالہ۔ داغ ساماں ہے
م برقِ خرمنِ راحت۔ خونِ گرمِ دہقاں ہے
حیرت طپیدنہا۔ خوں بہائے دیدنہا
رنگِ گل کے پردے میں آئینہ پرافشاں ہے
عشق کے تغافل سے ہرزہ گردیِ عالم
روئے شش جہت آفاق پشتِ چشمِ زنداں ہے
غنچہ تا شگفتنہا۔ برگِ عافیت معلوم
م باوجودِ دلجمعی۔ خوابِ گل پریشاں ہے
گل بہ کوہ از لالہ۔ بزمِ سازِ بیتابی
مثلِ دودِ مجمرہا۔ داغ بال افشاں ہے
اے کرم نہ ہو غافل۔ ورنہ ہے اسد بیدل
از گہر صدف خالی پشتِ چشمِ نیساں ہے

هم سے رنجِ بیتابی۔ کس طرح اٹھایا جائے
مطبوعہ داغِ پشتِ دستِ عجز۔ شعلہ خس بہ دنداں ہے

شورِ تمثال ہے کس رشکِ چمن کا یارب — آئینہ بیضۂ بلبل نظر آتا ہے مجھے

حیرتِ آئینہ انجام جنوں ہوں جوں شمع — کسقدر داغِ جگر شعلہ اُٹھاتا ہے مجھے

میں ہوں اور حیرتِ جاوید۔ مگر ذوقِ خیال — بہ فسونِ نگہِ ناز ستاتا ہے مجھے

حیرتِ فکرِ سخن سازِ سلامت ہے اسد — دل پس زانوے آئینہ بٹھاتا ہے مجھے

مطلع

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے — سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

معل

کوہ کے ہوں بارِ خاطر۔ گر صدا ہو جایئے — بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جایئے

یاد رکھیے نازہاے التفاتِ اوّلیں — آشیانِ طائرِ رنگِ رسا ہو جایئے

م

بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس — از سرِ نو زندگی ہو۔ گر رہا ہو جایئے

لطفِ عشقِ ہر یک اندازِ دگر دکھلائیگا — بے تکلف یک نگاہِ آشنا ہو جایئے

داد از دستِ جفاے صدمۂ ضرب المثل — گر بہ افتادگی۔ جوں نقشِ پا ہو جایئے

وسعتِ مشرب نیازِ کلفتِ وحشت اسد
یک بیاباں سایۂ بالِ ہما ہو جایئے

غل

داغِ پشتِ دستِ عجز۔ شعلہ خس بہ دنداں ہے

وحشت کہاں کہ بیخودی انشا کرے کوئی	قلمی	ہستی کو لفظِ معنیٔ عنقا کرے کوئی
ہے لختِ دل سے جوں مژہ ہر خار شاخِ گل لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل	م	تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی
جو کچھ ہے محوِ شوخیِ ابروئے یار ہے		آنکھوں کو رکھ کے طاق پہ دیکھا کرے کوئی
ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد ناز خیز ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز	م	یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز	م	تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
عرضِ سرشک پہ فضائے زمانہ تنگ		صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی
وہ شوخ اپنے حسن پہ مغرور ہے کہ اسد		دکھلا کے اس کو آئینہ توڑا کرے کوئی

مطبوعہ

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

باغ تجھ بن گلِ نرگس سے ڈراتا ہے مجھے	قلمی	چاہوں گر سیرِ چمن آنکھ دکھاتا ہے مجھے
نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک	م	آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے
جوہرِ تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم	م	ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے
مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے	م	آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

عجزِ دیدنہا بہ نازو ناز رفتنہا بچشم — جادۂ صحرائے آگاہی شعاعِ جلوہ ہے

اختلافِ رنگ و بو طرحِ بہارِ بیخودی — صلحِ کل گردِ ادب گاہِ نزاعِ جلوہ ہے

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن — م — چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

حسنِ خوباں بسکہ بیقدرِ تماشا ہے اسدؔ
آئینہ یک دستِ ردِ امتناعِ جلوہ ہے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی — م قمی — مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزمائے عمر — م — فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر — م — کب تک خیالِ طرۂ لیلا کرے کوئی

افسردگی نہیں۔ طرب انشائے التفات — م — ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے — م — آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

تمثالِ جلوہ عرض کر اے حسن۔ کب تلک — آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی

چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی — م — کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

بیکاریٔ جنوں کو ہے۔ سر پیٹنے کا شغل — م — جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

حسن فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

غفلتِ استعدادِ ذوق و مدعا غافل اسد

پنبۂ گوشِ حریفاں بود و تارِ نغمہ ہے

خود فروشیہائے ہستی بسکہ جائے خندہ ہے	قلمی	تا شکستِ قیمتِ دلہا صدائے خندہ ہے
شوخیِ اظہارِ دنداںنما برائے خندہ ہے عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے	م	دعوئے جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے
ہیں عدم میں غنچہ ہا عبرت کشِ انجامِ گل ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل	م	یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے
عیشِ بیتابی حرامِ کلفتِ افسردگی کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام	م	عرضِ دنداں در دلِ افشردن بنائے خندہ ہے ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے
نقشِ عبرت در نظر یا نقدِ عشرت در بساط		دو جہاں وسعت بہ قدرِ یک فضائے خندہ ہے
جائے استہزا ہے عشرت کوشیِ ہستی۔ اسد		صبح و شبنم فرصتِ نشو و نمائے خندہ ہے

مطبوعہ

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں

دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے	قلمی	آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

اسدؔ بہارِ تماشائے گلستانِ حیات
وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

قلمی

شوخیِ مضرابِ جولاں۔ آبیارِ نغمہ ہے
برگریزِ ناخنِ مطرب بہارِ نغمہ ہے
کس سے اے غفلت تجھے تعبیرِ آگاہی ملے
گوشہا سیمابی و دل بیقرارِ نغمہ ہے
سازِ عیشِ بیدلی ہے خانہ ویرانی مجھے
سیلِ یاں کوکِ صدائے آبشارِ نغمہ ہے
سنبلی خواں ہے بہ ذوقِ تارِ گیسوئے دراز
نالۂ زنجیرِ مجنوں رشتہ دارِ نغمہ ہے
شوخیِ فریاد سے ہے پردۂ زنبورِ گل
کسوتِ ایجادِ بلبل۔ خارخارِ نغمہ ہے
نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبزِ جویبارِ نغمہ ہے م
ہم نشیں مت کہہ کہ "برہم کر نہ بزمِ عیشِ یار" م

صبح ناپیدا ہے کلفت خانۂ ادبار میں
توڑنا ہوتا ہے رنگِ یک نفس ہر شب مجھے

شومیٔ طالع سے ہوں ذوقِ معاصی میں اسیر
نامۂ اعمال ہے تاریکیٔ کوکب مجھے

درو ناپیدا و بیجا تہمتِ وارستگی
پردہ دارِ یاوگی ہے وسعتِ مشرب مجھے

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں
م آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
م عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے
م تھی کشاد و بستِ مژہ سیلیٔ ندامت ہے

نگاہِ خفتہ سرِ رشتۂ سلامت ہے
م پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ
ا نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
م جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی
م تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

	واں واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے وعدہ آنیکا وفا کیجے۔ یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری۔ واہ! واہ! پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی میرزا یوسف ہے غالب یوسفِ ثانی مجھے	
نل	یاد ہے شادی میں "عقدِ نالہ" "یارب" مجھے یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ "یارب" مجھے سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے	م
	ہے کشادِ خاطرِ وابستہ در، رہنِ سخن تھا طلسمِ قفلِ ابجد، خانۂ مکتب مجھے	م
	یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے	م

ہے گریباں گیرِ فرصت ذوقِ عریانی مجھے

وا کیا ہرگز نہ میرا عقدۂ تارِ نفس

ناخنِ بریدہ ہے تیغِ صفاہانی مجھے

ہوں ہیولائے دو عالم صورتِ تقریر اسدؔ!

فکر نے سونپی خموشی کی گریبانی مجھے

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے

کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں

مرحبا میں۔ کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

کیوں نہ ہو بے التفاتی۔ اس کی خاطر جمع ہے

جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی

لکھدیا منجملۂ اسباب۔ ویرانی مجھے

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے

اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

مطبوعہ

یک شکستِ رنگِ گل صد جنبشِ مہمیز ہے

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو

یعنی اِس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی

وائے ناکامی کہ اِس کافر کا خنجر تیز ہے

تمی

تر جبیں[لہ] رکھتی ہے شرمِ قطرہ سامانی مجھے

موجِ گرداب حیا ہے چینِ پیشانی مجھے

شبنم آسا گو مجالِ سبحہ گردانی مجھے

ہے شعاعِ مہر زنّارِ سلیمانی مجھے

بلبلِ تصویر ہوں بیتابِ اظہارِ تپش

جنبشِ نالِ قلم۔ جوشِ پریشانی مجھے

ضبطِ سوزِ دل ہے وجہِ حیرتِ اظہارِ حال

داغ ہے مہرِ دہن۔ جوں چشمِ قربانی مجھے

شوخ ہے مثلِ حباب از خویش بیروں آمدن

لہ یہ دو ہم طرح غزلیں جن میں ایک شعر بھی مشترک نہیں بالمقابل درج ہیں ان سے غالب کی شاعری کے مختلف دوروں کا اندازہ ہوتا ہے

تعصب شرم آفریں ہے رنگِ بے بہائے خود بینی		سفیدی آئینہ کی پنبۂ روزن نہ ہو جائے

سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالب
اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

غمی

وہ مژہ بر آہ رو بانیدن از دل تیز ہے
یہ زمیں شلِ نیستاں سخت ناوک خیز ہے
ہو سکے کیا خاک؟ دست و بازوئے فرہاد سے
بیستوں خوابِ گرانِ خسروِ پرویز ہے
ان ستم کیشوں کے کھائے ہیں زبس تیرِ نگاہ
پردۂ بادام یک غربالِ حسرت بیز ہے
خوں چکاں ہے جادہ مانندِ رگِ سودائیاں
سبزۂ صحرائے اُلفت نشترِ خوں ریز ہے
جلوۂ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد
۴ عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد

جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے
ہے بہارِ تیز رو گلگونِ نکہت پر سوا

بہ ذوقِ شوخیِ اعضا تکلف بارِ بستر ہے
معافِ پیچ و تابِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے

معمائے تکلف سر بسر چشم پوشیدن
گدازِ شمعِ محفل پیچشِ طومارِ بستر ہے

خرد فرشِ رہ و دل ناتواں و آرزو مضطر
بہ پائے خفتہ سیرِ وادیِ پرخارِ بستر ہے

سرشکِ سر بہ صحرا دادہ۔ نور العینِ املا
سرشکِ سر بہ صحرا دادہ۔ نور العینِ آنکھ
م
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ وحشتِ شبہا
بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
م
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

اسد جوشِ بہارِ دیدۂ بیدار کے صدقے
کبھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلفِ مشکیں کی
م
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
سعید
مرا سر رنجِ بالیں ہے۔ مرا تن بارِ بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب
کہ بیتابی سے ہر یک تارِ بستر خارِ بستر ہے

قلمی

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے
غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

بہ پاسِ شوخیِ مژگاں سرِ ہر خار سوزن ہے
تبسم برگِ گل کو بخیۂ دامن نہ ہو جائے

جراحت دوزیِ عاشق ہے جائے رحم ترساہوں
کہ رشتہ تارِ اشکِ دیدۂ سوزن نہ ہو جائے

بہ بزمِ مے پرستی حسرتِ تکلیف بیجا ہے	قلمی	کہ جامِ بادہ کف بر لب بہ تکلیفِ تقاضا ہے
نشاطِ دیدۂ بینا ہے۔ کو خواب و چہ بیداری		بہم آوردہ مژگاں بوسۂ روئے تماشا ہے
ملالِ شوخیِ اندیشہ تابِ دردِ نومیدی		کفِ افسوس سودن عہدِ تجدیدِ تمنا ہے
نگہ معمارِ حسرتہا۔ چہ آبادی۔ چہ ویرانی		کہ مژگاں جس طرف وا ہو بہ کفِ دامانِ صحرا ہے
نسودے آبلوں میں گر سرشکِ دیدۂ نم سے		بہ جولاں گاہِ نومیدی نگاہِ عاجزاں پا ہے
بہ سختی ہائے قیدِ زندگی۔ معلوم آزادی		شرر در بندِ دامِ رشتۂ رگہائے خارا ہے
اسدؔ یاسِ تمنا ہے نہ رکھ امیدِ آزادی		گدازِ آرزوہا۔ آبیارِ آرزوہا ہے
میری[1] ہستی۔ فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے	مطبوعہ	جسے کہتے ہیں نالہ۔ وہ اسی عالم کا عنقا ہے
خزاں کیا؟ فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو		وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
وفائے دلبراں ہے اتفاقی۔ ورنہ اے ہمدم		اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

ملالِ شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

عیادت بسکہ تجھ سے گرمیِ بازارِ بستر ہے خوشا اقبالِ رنجوری۔ عیادت کو تم آئے تو	قلمی م	فروغِ شمعِ بالیں۔ طالعِ بیدارِ بستر ہے

[1] مطبوعہ دیوانوں سے یہ چاروں شعر قلمی نسخے کے حاشیہ پر اپنی متداول غزلوں کے ساتھ درج ہیں جو غالباً بعد میں لکھی گئیں

محبت طرزِ پیوندِ نہالِ دوستی جانے
دویدن ریشہ ساں مفتِ رگِ خوابِ زلیخا ہے

کیا یکسر گدازِ دل نیازِ جوششِ حسرت
سویدا نسخۂ تہ بندیِ داغِ تمنا ہے

ہجومِ ریزشِ خوں کے سبب رنگ اُڑ نہیں سکتا
حنائے پنجۂ صیاد مرغِ رشتہ برپا ہے

اسدؔ گر نامِ والائے علی تعویذِ بازو ہو
غریقِ بحرِ خوں تمثال در آئینہ رہتا ہے

اثر سوزِ محبت کا قیامت بے محابا ہے
کہ رگ سے سنگ میں تخمِ شرر کا ریشہ پیدا ہے (تعل)

نہاں ہے گوہرِ مقصود جیبِ خود شناسی میں
کہ یاں غواص ہے تمثال اور آئینہ دریا ہے

عزیزو[ل] ذکرِ وصلِ غیر سے مجھ کو نہ بہلاؤ
کہ یاں افسونِ خواب افسانۂ خوابِ زلیخا ہے

تصور بہرِ تسکینِ تپیدنہائے طفلِ دل
بباغِ رنگہائے رفتہ گلچینِ تماشا ہے

بسعیِ غیر ہے قطعِ لباسِ خانہ ویرانی
کہ تارِ جادۂ رہ رشتۂ دامانِ صحرا ہے

مجھے شبہائے تاریکِ فراقِ شعلہ رویاں میں
چراغِ خانۂ دل سوزشِ داغِ تمنا ہے

ترے نوکر ترے در پر اسدؔ کو ذبح کرتے ہیں
ستمگر۔ ناخدا ترس۔ آشنا کش۔ ماجرا کیا ہے

ل متن میں یہ شعر پہلے یوں تھا۔

عزیزاں گرچہ بہلاتے ہیں ذکرِ وصل سے لیکن
مجھے افسونِ خواب افسانۂ خوابِ زلیخا ہے

بسکہ ویرانی سے کفر و دیں ہوئے زیر و زبر — گردِ صحرائے حرم تا کوچۂ زنار ہے

اے سرِ شوریدہ، نازِ عشق و پاسِ آبرو — یک طرف سودا و یک سو منتِ دستار ہے

وصل میں دل انتظارِ طرفہ رکھتا ہے مگر — فتنہ تاراجِ تمنا کے لیے درکار ہے

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا — م — ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

خانماں ہا پائمالِ شوخیِ دعوے اسد — سایۂ دیوار سیلابِ در و دیوار ہے

جی[1] جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں — مثہ — ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

آگ[1] سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا — ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

ہے[1] وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ — جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

مجھ[2] سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی — زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

تغافل مشربی سے ناتمامی بسکہ پیدا ہے — می — نگاہِ نازِ چشمِ یار میں زنارِ مینا ہے

تصرف وحشیوں میں ہے تصورہائے مجنوں کا — سوادِ چشمِ آہو عکسِ خالِ روئے لیلیٰ ہے

[1] یہ تینوں شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر غالباً غالب کے قلم کے بڑھائے ہوئے موجود ہیں۔
[2] یہ شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر ایک دوسرے قافیہ کی غزل کے ساتھ درج ہے۔ اور فرق فقط یہ ہے کہ وہاں قافیہ "بیزار" کی جگہ "بیمار" ہے (ملاحظہ ہو ص۲۱۱)

دریں عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر	م	ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے
		درد کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے
وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں	م	صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے
اثرِ آبلہ کرتا ہے بیاباں روشن		جادہ جوں رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں	م	صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت مت پوچھ		
بیکسی ہائے شبِ ہجر کی حسرت ہے ہے	م	سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
بیخودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو	م	پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے
شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے	م	جوں گلِ شمع ہو نظارہ پریشاں مجھ سے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے	م	آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

بسکہ حیرت سے ز پا افتادۂ زنہار ہے	قلمی	ناخنِ انگشت تبخالِ لبِ بیمار ہے
زلف سے شب درمیاں دادن نہیں ممکن دریغ		ورنہ صد محشر بہ رہنِ صافیِ رخسار ہے
در خیال آباد سودائے سرِ مژگانِ دوست		صد رگِ جاں جادہ آسا وقفِ نشتر زار ہے

شوخیِ اظہار کو جز وحشتِ مجنوں اسدؔ
بسکہ لیلائے سخن محمل نشینِ راز ہے

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
(سہو) سرمہ۔ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ۔ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پاانداز ہے

خوابِ جمعیتِ محمل ہے پریشاں مجھ سے
(قلمی) رگِ بستر کو ملی شوخیِ مژگاں مجھ سے

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
(م) آرزو خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
کسقدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

کنجِ تاریک و کمیں گیریٔ اختر شمری
عینکِ چشم بنا روزنِ زنداں مجھ سے

اے تسلی ہوسِ وعدہ فریب افسوں ہو
ورنہ کیا ہو نہ سکے نالۂ بساماں مجھ سے

بستنِ عہدِ محبت ہمہ نادانی تھا
چشمِ نکشودہ رہا عقدۂ پیماں مجھ سے

آتش افروزیٔ یک شعلۂ ایماں تجھ سے
چشمک آرائیٔ صد شہرِ چراغاں مجھ سے

اے اسدؔ! دسترسِ وصل تمنا معلوم
کاش ہو قدرتِ برچیدنِ داماں مجھ سے

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
(قلمی) میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

جادہ ہے طرزِ گفتگوئے یار اے اسد
یاں جز فسوں نہیں اگر افسانہ چاہیے

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے	قلمی	صبح کی مانند زخمِ دل گریبانی کرے
میکدہ گر چشمِ مستِ یار سے پائے شکست	م	موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے
خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد	م	یکقلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے
ہاتھ پر گر ہاتھ مارے یار وقتِ قہقہہ		کرمکِ شب تاب آسا مہ پر افشانی کرے
وقت اس افتادہ کا خوش جو قناعت سے اسد		نقشِ پائے مور کو تختِ سلیمانی کرے
جلوہ کا تیرے وہ عالم ہے اگر کیجے خیال	مطبوعہ	دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

چشمِ خوباں سے فروشِ نشہ زارِ ناز ہے	قلمی	سرمہ گویا موجِ دودِ شعلۂ آواز ہے
ہے صریرِ خامہ ریزشہائے استقبالِ ناز		نامہ خود پیغام کو بالِ پرِ پرواز ہے
سرنوشتِ اضطراب انجامیِ الفت نہ پوچھ		نالِ خامہ خار در پیراہنِ آغاز ہے
نالۂ دل نغمہ ریزاں ہے بہ مضرابِ خیال		رشتۂ پایاں نوا سامانِ بندِ ساز ہے
شرم ہے طرزِ تلاشِ انتخابِ یک نگاہ		اضطرابِ چشم بر پا دوختہ غماز ہے

ہنوز آئینہ خلوت گاہ و نازِ ربطِ مژگاں ہے

تکلف برطرف ذوقِ زلیخا جمع کر۔ ورنہ
پریشاں خوابِ آغوشِ وداعِ یوسفستاں ہے

اسد جمعیتِ دل در کنارِ بیخودی خوشتر
دو عالم آگہی سامانِ یک خوابِ پریشاں ہے

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دستگرداں ہے		مطبوعہ

غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا۔ قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

عاشق نقابِ جلوۂ جانانہ چاہیے	قلمی	فانوسِ شمع کو پرِ پروانہ چاہیے
ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں	م	معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے
پیدا کریں دماغِ تماشائے سرو و گل		حسرت کشوں کو ساغر و مینا نہ چاہیے
دیوانگاں ہیں حاملِ رازِ نہانِ عشق		اے بے تمیز گنج کو ویرانہ چاہیے
اُس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں	م	شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے
ساقی بہارِ موسمِ گل ہے سرور بخش		پیماں سے ہم گزر گئے۔ پیمانہ چاہیے

زبس دوشِ رمِ آہو پہ ہے محمل تمنا کا
جنونِ قیس سے بھی شوخئِ لیلیٰ نمایاں ہے
نقابِ یار ہے غفلت نگاہی اہلِ بینش کی
مژہ پوشیدہ بینا پردۂ تصویرِ عریاں ہے
اسد بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے

تعلی ۴
ہجومِ نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے
کجا ہے۔ کو عرق سعیِ عروجِ نشہ رنگیں تر
خطِ رخسارِ ساقی تا خطِ ساغر چراغاں ہے
رہا بے قدرِ دل در پردۂ جوشِ ظہور آخر
گل و نرگس بہم آئینۂ اقلیم کوراں ہے
تکلف سازِ رسوائی ہے غافل شرمِ رعنائی
دلِ خوں گشتہ۔ در دستِ حنا آلودہ عریاں ہے
تماشا سرخوشِ غفلت ہے با وصفِ حضورِ دل

	صفائے اشک میں داغِ جگر جلوہ دکھاتے ہیں پرِ طاؤس گویا برقِ ابرِ چشمِ گریاں ہے بہ بوئے زلفِ مشکیں یہ دماغ آشفتۂ رم ہیں کہ شاخِ آہواں دودِ چراغ آسا پریشاں ہے تکلف برطرف۔ ہے جانستاں تر لطفِ بدخویاں نگاہِ بے حجابِ یار تیغِ تیزِ عریاں ہے اسدؔ یہ فرطِ غم نے کی تلف کیفیتِ شادی ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی کہ صبحِ عید مجھکو بدتر از چاکِ گریباں ہے	م م
قلمی	جہاں زندانِ موجستانِ دلہائے پریشاں ہے طلسمِ شش جہت یک حلقۂ گردابِ طوفاں ہے نہیں ہے مردنِ صاحبدلاں جز کسبِ جمعیت سویدا میں نفس مانندِ خط در نقطہ پنہاں ہے غبارِ دشتِ وحشت سرمہ سازِ انتظار آیا کہ چشمِ آبلہ میں طولِ میلِ راہ مژگاں ہے	

یہ کاسۂ زانو بھی اک جامِ گدائی ہے
وہ دیکھ کے حسن اپنا مغرور ہوا غالبؔ
صد جلوۂ آئینہ یک صبحِ جدائی ہے

یوں بعدِ ضبطِ اشک پھروں گرد یار کے	قلمی	پانی پئے کسو پہ کوئی جیسے وار کے
سیمابِ پشت گرمیِ آئینہ دے ہے ہم	م	حیراں کئے ہوئے ہیں دلِ بیقرار کے
بعد از وداعِ یار بخوں در طپیدہ ہیں		نقشِ قدم ہیں ہم کفِ پائے نگار کے
ظاہر ہے ہم سے کلفتِ بختِ سیاہ روز		گویا کہ تختۂ مشق ہیں خطِ غبار کے
حسرت سے دیکھ رہتے ہم آبِ رنگِ گل		مانندِ شبنم اشک ہیں مژگانِ خار کے
آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے	م	اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے اسدؔ
لائق نہیں رہے ہیں غمِ روزگار کے

قلمی

بہ نقصِ ظاہری رنگِ کمالِ طبع پنہاں ہے
کہ بہر مدعائے دل زبانِ لال نالاں ہے
خموشی خانہ زادِ چشمِ بے پروانگاہاں ہے
غبارِ سرمہ یاں گرد سوادِ سنبلستاں ہے

خوابِ نازِ گلرخاں دودِ چراغِ کشتہ ہے

ہے دلِ افسردہ داغِ شوخیِ مطلب اسد

شعلہ آخر فالِ مقصودِ چراغِ کشتہ ہے

مطبوعہ

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں

ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

قلمی

گلشن کو تری صحبت ازبسکہ خوش آئی ہے

ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے م

واں کنگرِ استغنا ہر دم ہے بلندی پر

یاں نالے کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے م

آئینہ نفس سے بھی ہوتا ہے کدورت کش

عاشق کو غبارِ دل اک وجہ صفائی ہے

ازبسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے

داغوں کا نظر آنا خود چشم نمائی ہے

جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے م

ہنگامِ تصور ہوں دریوزہ گرِ بوسہ

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جسقدر جام و سبو۔ میخانہ خالی ہے م
اسد مت رکھ تعجب خردماغی ہائے منعم کا
کہ یہ نامرد بھی شیر افگنِ میدانِ قالی ہے

نشۂ مے بے چمن دودِ چراغِ کشتہ ہے قی
جام۔ داغِ شعلہ اندودِ چراغِ کشتہ ہے
رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے م
نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے
داغِ ہمدیگر ہیں اہلِ باغ۔ گر گل ہو شہید
لالہ چشمِ حسرت آلودِ چراغِ کشتہ ہے
شور ہے کس بزم کی عرضِ جراحت خانہ کا
صبح یک زخمِ نمک سودِ چراغِ کشتہ ہے
نامرادِ جلوہ ہر عالم میں حسرت گل کرے
لالہ داغِ شعلہ فرسودِ چراغِ کشتہ ہے
ہو جہاں تیرا دماغِ نازِ مستِ بیخودی

بہ پاے خامۂ مو طے رہِ وصفِ کمر کیجے
کہ تارِ جادۂ سرمنزلِ نازک خیالی ہے

اسدؔ۔ اُٹھنا قیامت قامتوں کا۔ وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

قلمی

۴ تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

بتانِ شوخ کا دل سخت ہو گا کس قدر یارب
مری فریاد کو کہسار سازِ عجز نالی ہے

نشانِ بے قرارِ شوق جز مژگاں نہیں باقی
کئی کانٹے ہیں اور پیراہنِ شکلِ نہالی ہے

جنوں کرائے چمن تحریرِ درسِ شغلِ تنہائی
نگاہِ شوق کو صحرا بھی دیوانِ غزالی ہے

یہ مستی ہے اہلِ خاک کو ابرِ بہاری سے
زمیں[۱] جوشِ طرب سے جامِ لبریزِ سفالی ہے

۱ پہلے یہ مصرع متن میں یوں لکھا تھا۔ "زمیں کیفیتِ یک جامِ لبریزِ سفالی ہے"

نقشِ قیس، کہ ہے چشم و چراغِ صحرا | م | گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق | م | نوحۂ غم ہی سہی۔ نغمۂ شادی نہ سہی
نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا | م | گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

م

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

قلمی

دلِ بیمارِ از خود رفتہ تصویرِ نہالی ہے
کہ مژگاں ریشہ دارِ نیستانِ شیر قالی ہے
سرورِ نشۂ گردش اگر کیفیت افزا ہو
نہاں۔ ہر گردبادِ دشت میں جامِ سفالی ہے
عروجِ نشہ ہے۔ سرتاقدم۔ قدِ چمن رویاں
بجائے خود وگرنہ سرو بھی مینائے خالی ہے
ہوا آئینہ جامِ بادہ۔ عکسِ روئے گلگوں سے
نشانِ خالِ رخ۔ داغِ شرابِ پرتگالی ہے

لہ متن میں اس مشہور شعر کا مصرعِ ثانی پہلے یوں تھا۔ "نہ ہوے گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی"
مگر حاشیے پر وہ اصلاح غالب کی قلمی موجود ہے۔ جواب عام طور پر متداول ہے۔ یہ ایک غزل ہی اس بات کا
قطعی ثبوت ہے کہ بیس سال کی عمر سے پہلے بھی غالب کی شاعری کس درجہ کمال تک پہنچ چکی تھی۔

خاکِ فرصت برسرِ ذوقِ فنا۔ اے انتظار
ہے غبارِ شیشۂ ساعت رمِ آہو مجھے

اضطرابِ عمر بے مطلب نہیں آخر کہ ہے
جستجوئے فرصتِ ربطِ سرِ زانو مجھے

چاہئے درمانِ ریشِ دل بھی تیغِ یار سے
مرہمِ زنگار ہے وہ وسمۂ ابرو مجھے

کثرتِ جور و ستم سے ہو گیا ہوں بے دماغ
خوبرویوں نے بنایا غالبؔ بدخو مجھے

قلمی
باعثِ واماندگی ہے عمرِ فرصت جو مجھے
کر دیا ہے پا بہ زنجیرِ رمِ آہو۔ مجھے

م
پا بہ دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد
خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے

فرصتِ آرامِ غش ہستی ہے بحرانِ عدم
ہے شکستِ رنگِ امکاں گردشِ پہلو مجھے

م
دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہِ آشنا۔ تیرا سرِ ہر مو مجھے

م
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

سازِ ایمائے فنا ہے عالمِ پیری اسدؔ
قامتِ خم سے ہے حاصل شوخیٔ ابرو مجھے

قلمی
نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو۔ تو۔ یہ بھی نہ سہی

م
خار خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے
شوق۔ گلچینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

م
مے پرستاں خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

چشمِ پرواز و نفس خفتہ مگر ضعفِ امید		شہپرِ کاہ پئے مژدہ رسانی مانگے
تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے	م	دل وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے
وحشتِ شورِ تماشا ہے کہ جوں نکہتِ گل		نمکِ زخمِ جگر بال فشانی مانگے
نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب	م	پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
وہ تپِ عشق تمنا ہے کہ جوں رشتۂ شمع وہ تپِ عشق تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع	م	شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

گر ملے حضرتِ بیدل کا خطِ لوحِ مزار
اسد آئینۂ پرواز معانی مانگے

[1] ہم زباں آیا نظر فکرِ سخن میں تو مجھے	قلمی	مردمک ہے طوطیٔ آئینۂ زانو مجھے
یادِ مژگاں میں بہ نشتر زارِ سودائے[2] خیال		چاہیے وقتِ تپش یکدست صد پہلو مجھے

سلہ قلمی دیوان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل پہلے کہی گئی تھی پھر اسکے کچھ عرصے بعد اس طرح کی دوسری غزل کہی گئی جو آگے آتی ہے۔ چنانچہ اس نسخے پر نظر ثانی کرتے وقت اس غزل کے حاشیے پر اسکو غالباً غالب نے خود بڑھا دیا۔ مگر جب بعد دیکھا تو وہ غزل پہلے ہی لکھی ہوئی موجود تھی اسلئے وہاں حاشیے پر یہ لکھ دیا کہ "غلط مکرر نوشتہ شد"۔ شاید اسی وقت مقطع کا مصرع ثانی میں قلمی ہی بدلا گیا۔ کیونکہ پہلے وہ مصرع یوں تھا۔ "خوبرویوں نے بنایا ہے اسد بدخو مجھے"
ایسی ہی اصلاحوں سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ یہ ترمیمیں بخطِ غالب کی قلمی ہیں۔

سلہ یہ شعر پہلے یوں تھا۔

یادِ مژگاں میں بہ نشتر زارِ صحرائے خیال   چاہیے بہرِ تپش یکدست صد پہلو مجھے

غریقِ بحر جو یاے خس و خاشاکِ ساحل ہے

بہا ہے یاں تک اشکوں میں غبارِ کلفتِ خاطر
کہ چشمِ تر میں ہر اک پارہ دل پاے درِ گل ہے

رفوے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی[1]
۴ سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

نکلتی ہے تپش میں بسملوں کی برق کی شوخی
غرض اب تک خیالِ گرمیِ رفتارِ قاتل ہے

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ
۴ چٹکنا غنچۂ دل کا صداے خندۂ دل ہے

قلمی

تشنۂ خونِ تماشا جو وہ پانی مانگے
آئینہ رخصتِ اندازِ روانی مانگے

رنگ نے گل سے دمِ عرضِ پریشانیِ بزم
برگِ گل ریزۂ مینا کی نشانی مانگے

زلف تحریرِ پریشانِ تقاضا ہے مگر
شانہ ساں مو بہ زباں خامۂ مانی مانگے

آمدِ خط سے نہ کر خندۂ شیریں کہ مباد
چشمِ مور آئینۂ دل نگرانی مانگے

ہوں گرفتارِ کمینگاہِ تغافل کہ جہاں
خوابِ صیاد سے پروازِ گرانی مانگے

[1] یہ مشہور شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر درج ہے، متن میں نہیں ہے۔

اسدؔ جز آب بخشیدن ز دریا خضر کو کیا تھا
ڈبوتا چشمۂ حیواں میں گر کشتی سکندر کی

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے	تھی	طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے	م	نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو	م	ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر	م	خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے
دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی	م	غیرِ گل آئینۂ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے	م	وائے اگر عہد استوار نہیں ہے

تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالبؔ
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے
م

تھی

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے
ہوا ہے مانعِ عاشق نوازی نازِ خود بینی
تکلف بر طرف آئینۂ تمییز حائل ہے
بہ سیلِ اشک لختِ دل ہے دامن گیر مژگاں کا

م

تکلف برطرف۔ فرہاد اور اتنی سبکدستی
خیال آساں تھا لیکن خوابِ خسرو نے گرانی کی

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گل فشانی کی م

اسد کو بوریے میں دھر کے پھونکا موجِ ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

نکوہش ہے سزا۔ فریادیِ بیدادِ دلبر کی	قلمی	مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی
رگِ لیلیٰ کو۔ خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے	م	اگر بووے بجائے دانہ۔ دہقاں نوک نشتر کی
بجز دیوانگی ہوتا نہ انجامِ خود آرائی		اگر پیدا نہ کرتا آئینہ زنجیر جوہر کی
پرِ پروانہ۔ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا	م	ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
غرورِ لطفِ ساقی نشۂ بیباکیِ مستاں		نمِ دامانِ عصیاں ہے طراوت موجِ کوثر کی
مرا دل مانگتے ہیں عاریت اہلِ ہوس شاید لہ		یہ جانا چاہتے ہیں آج دعوت میں سمندر کی
کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت	م	کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی
کہاں تک روؤں اُس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے	م	مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

لہ مقطع سے پہلے کے یہ تینوں شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر درج ہیں اور یہ ہے دو شعر [illegible] میں پہلا شعر معلوم ہوتا ہے کہ [illegible]

ہوا شرمِ تہیدستی سے وہ بھی سرنگوں آخر
بس اے زخمِ جگر اب دیکھ لے شورش نمکداں کی
سیاہی[له] جیسے گرجائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی م
بیادِ گرمیٔ صحبت برنگِ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیونکہ غالبؔ سوزشیں داغِ نمایاں کی

قلمی جنوں تہمت کشِ تسکیں نہو۔ گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے۔ لذت زندگانی کی م
کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر۔ موجِ آب کو۔ فرصت روانی کی م
نہ کھینچ اے سعیِ دستِ نارسا۔ زلفِ تمنا کو
پریشاں تر ہے موئے خامہ سے تدبیر مانی کی
کہاں ہم بھی رگ و پے رکھتے ہیں انصاف بہتر ہے
نہ کھینچے طاقتِ خمیازہ تہمت ناتوانی کی

له یہ معروف شعر پہلے متن میں نہ تھا۔ بعد میں حاشیے پر بڑھایا گیا ہے۔

ڈھونڈے ہے اُس مغنّیِ آتش نفس کو جی	نجو	جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

قلمی

کہوں کیا گرمجوشی میکشی میں شعلہ رویاں کی
کہ شمعِ خانۂ دل آتشِ مے سے فروزاں کی

ہمیشہ مجھکو طفلی میں بھی مشقِ تیرہ روزی تھی
سیاہی ہے مرے ایام میں لوحِ دبستاں کی

دریغ! آہِ سحرگہ کارِ بادِ صبح کرتی ہے
کہ ہوتی ہے زیادہ سرد مہری شمع رویاں کی

مجھے اپنے جنوں کی بے تکلف پردہ داری تھی
ولیکن کیا کروں آوے جو رسوائی گریباں کی

ہنر پیدا کیا ہے میں نے حیرت آزمائی میں
کہ جوہر آئینہ کا ہر پلک ہے چشمِ حیراں کی

خدایا کس قدر اہلِ نظر نے خاک چھانی ہے
کہ ہیں صد رخنہ جوں غربال دیواریں گلستاں کی

نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حسن کا	تم	جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے
میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں	م	مانا۔ کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

گذرا اسدؔ۔ مسرتِ پیغام یار سے قاصد پہ مجھکو رشکِ سوال وجواب ہے	م

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے	تملی	صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے
ہے پیچتابِ رشتۂ شمعِ سحر گہی		خجلت گدازیٔ نفسِ نارسا مجھے
واں رنگہا بہ پردۂ تدبیر ہیں ہنوز		یاں شعلۂ چراغ ہے برگِ حنا مجھے
کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں	م	آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے
پروازہا نیازِ تماشائے حسنِ دوست		بالِ کشادہ ہے نگہِ آشنا مجھے
از خود گذشتگی میں خموشی پہ حرف ہے		موجِ غبارِ سرمہ ہوئی ہے صدا مجھے
کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ؟	م	شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے
تا چند پست فطرتیٔ طبعِ آرزو		یارب ملے بلندیٔ دستِ دعا مجھے
یاں آب ودانہ موسمِ گل میں حرام ہے		زنارِ واگسستہ ہے موجِ صبا مجھے
یکبار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے		اے جوشِ عشق بادۂ مرد آزما مجھے
میں نے جنوں کی جو اسدؔ التماسِ رنگ		خونِ جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے

ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ		لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے
خوشا وہ دل کہ سراپا طلسمِ بے خبری ہو		جنون و یاس و الم رزقِ مدعا طلبی ہے
تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو	م	حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے
چمن میں کس کے یہ برہم ہوئی ہے بزمِ تماشا		کہ برگ برگ سمن شیشہ ریزۂ حلبی ہے
امامِ ظاہر و باطن، امیرِ صورت و معنی		علی ولی اسد اللہ جانشینِ نبی ہے

اسد[1] یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے
م

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے	نجی م	اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے
ظاہر ہے طرزِ قید سے صیاد کی غرض		جو دانہ دام میں ہے سو اشکِ کباب ہے
مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے	م	بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے
زخمی[2] ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا	م	نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے
جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت	م	غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے
بے چشمِ دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار		یعنی یہ ہر ورق ورقِ انتخاب ہے

[1] مروجہ دیوانوں میں اس مقطع میں "اسد" کی جگہ "دلا" لکھا ہوا ہے، اور یہ پورا شعر دونو دیوانوں میں مشترک ہے۔
[2] یہ اور اس کے بعد کا شعر قلمی دیوان کے حاشیے پر بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔

	ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ مجنوں جو مر گیا ہے، تو جنگل اداس ہے	م

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے	م	خوش ہوں، کہ میری بات سمجھنا محال ہے
کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ	م	دل، فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے
کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا	م	رحمت، کہ عذر خواہِ لبِ بے سوال ہے
ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی!	م	اے ذوقِ منفعل، یہ تجھے کیا خیال ہے
عالم بساطِ دعوتِ دیوانگی نہیں وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا	م	دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے
مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان	م	نافِ زمین ہے، نہ کہ نافِ غزال ہے
پہلو تہی نہ کر غم و اندوہ سے اسدؔ		دل وقفِ درد کر کہ فقیروں کا مال ہے

مطبوعہ	ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے	

نظر بہ نقصِ گدایاں کمالِ بے ادبی ہے	ق	کہ خارِ خشک کو بھی دعوئ چمن نسبی ہے

لہ چونکہ اس غزل کا مقطع بوقتِ انتخاب حذف کر دیا گیا تھا اسلئے غالباً بوقتِ نظرِ ثانی دوسرا مقطع کہکر بڑھایا گیا یہ قلمی نسخہ کے حاشیہ پر بھی لکھا ہے۔ اور مروجہ دیوانوں میں بھی موجود ہے۔ باقی تمام غزل بہ استثنائے مصرع (شعر پنجم) بالکل مشترک ہے۔

گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا	م	خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی	م	یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا	م	دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی	م	اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال	م	ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے
گوش مہجورِ پیام و چشم۔ محرومِ جمال	م	ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے
گر مصیبت تھی تو غربت میں اُٹھاتی اسد		میری دہلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب۔ ابھی اُلفت کا رنگ
رہگیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

مطبوعہ

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے	قلمی م	تسکیں کو دے نوید۔ کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر	م	ابتک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک	م	ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے
پی جسقدر ملے شبِ مہتاب میں شراب	م	اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا	م	ہرچند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے
کیا غم ہے اُس کو جس کا علی سا امام ہو		اتنا بھی اے فلک زدہ کیوں بدحواس ہے

کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا	م	آوے نہ کیوں پسند؟ کہ ٹھنڈا مکان ہے
ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر	م	ہم بھی اسی میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے
بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں	م	فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے
کیا خوب. تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟	م	بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
دہلی کے رہنے والو اسدؔ کو ستاؤ مت		بیچارہ چند روز کا یاں میہمان ہے
حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ	ملہ	غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گماں ہے

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے	غم	کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ	م	تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟	م	دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا	م	عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں	م	ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

ملہ موجودہ دیوانوں میں اس شعر کے مصرعِ ثانی میں تخلص ڈال کر مقطع بنا دیا ہے۔ اور بلاشبہ نہایت پاکیزہ ترمیم ہے

کہ میری خواب بندی کے لیے ہوگا فسوں وہ بھی

اسدؔ ہے دل میں دردِ اشتیاق و شکوہ ہجراں
مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوہ ہجراں م

خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
کرتے ہو شکوہ کس کا۔ تم اور بے وفائی!
صد رنگ گل کترنا۔ در پردہ قتل کرنا
طرفِ سخن نہیں ہے مجھ سے خدا نکردہ
طاقتِ فسانۂ باد۔ اندیشہ شعلہ ایجاد
ہر چند عمر گزری۔ آزردگی میں لیکن
ہے پاس میں اسدؔ کو ساقی سے بھی فراغت

م تمی

دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
سر پیٹتے ہیں اپنا۔ ہم اور نیکنامی
تیغِ ادا نہیں ہے پابندِ بے نیامی
ہے نامہ بر کو اُس سے دعوائے ہم کلامی
اے غم ہنوز آتش۔ اے دل ہنوز خامی
ہے شرحِ شوق کو بھی جوں شکوہ ناتمامی
دریا سے خشک گزرے مستوں کی تشنہ کامی

اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

مطبوعہ

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے

م تمی
م

جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

قمی بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی م

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف ۔ تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی م

مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی م

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دوں وہ بھی

نہ اتنا برشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی م

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی م

نہ کرتا کاش نالہ مجھکو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی م

نظر راحت پہ میری ۔ کر نہ وعدہ شب کے آنے کا

ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا	م	یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے
کیا پوچھے ہے بر خود غلطی ہائے عزیزاں		خواری کو بھی اک عار ہے عالی نسبوں سے
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد	م	زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے
گو تم کو رضا جوئیِ اغیار ہے۔ لیکن		جاتی ہے ملاقات کب ایسے سببوں سے
بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر	م	ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

مت پوچھ اسد وعدۂ کم فرصتیِ زیست
دو دن بھی جو کاٹے تو قیامت تعبوں سے

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی	تلمی	فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب	م	قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
لکد کوبِ حوادث سے نہ سر بر ہو سکی آخر لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی	م	مری طاقت۔ کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی
لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا پنہاں ہے	م	ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی
نہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا	م	اٹھے تھے سیرِ گل کو۔ دیکھنا شوخی بہانے کی
ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا	م	ترا آنا نہ تھا ظالم۔ مگر تمہید جانے کی
کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالب	م	بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

ردیف

"ی"

(١)

دل ہی نہیں کہ منتِ درباں اٹھائیے	قلمی	کس کو وفا کا سلسلہ جنباں اٹھائیے
تا چند داغ بیٹھیے نقصاں اٹھائیے		اب چار سوئے عشق سے دکاں اٹھائیے
صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے	م	طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے
ہستی فریب نامۂ موجِ سراب ہے		یک عمر نازِ شوخیِ عنواں اٹھائیے
ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق	م	یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے
ضبطِ جنوں سے ہر سرِ مو ہے ترانہ خیز		یک نالہ بیٹھیے تو نیستاں اٹھائیے
طرزِ خراشِ نالہ۔ سرشکِ نمک اثر		لطفِ کرم بدولتِ مہماں اٹھائیے
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم	م	اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے	م	یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

انگورِ سعی بے سروپائی سے سبز ہے
غالب بدوشِ دل خمِ مستاں اٹھائیے

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے	قلمی	تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

نغمۂ بیدلی اسد سازِ فسانگی نہیں
بسملِ دردِ خفتہ ہو۔ گریۂ ماجرا سمجھ

کلفتِ ربطِ این و آں غفلتِ مدعا سمجھ
شوق کرے جو سرگراں محملِ خواب پا سمجھ

جلوہ نہیں ہے دردِ سر آئینہ صندلی نگر
عکس کجا و کو نظر نقش کو مدعا سمجھ

حیرت اگر خرام ہے۔ کارِ نگہ تمام ہے
گر کفِ دست بام ہے آئینہ کو ہوا سمجھ

ہے خطِ عجزِ ما و تو۔ اوّل درسِ آرزو
ہے یہ[1] سیاقِ گفتگو کچھ نہ سمجھ فنا سمجھ

شیشۂ شکستِ اعتبار۔ رنگ بہ گردش ستوا
گر نہ شنیدہ کو بہار آنکھو تو صدا سمجھ

نغمہ ہے محوِ ساز رہ۔ نشّہ ہے بے نیاز رہ
رند تمام ناز رہ۔ خلق کو پارسا سمجھ

جنبشِ پہلوئے خیال رزقِ دو عالم احتمال
کل ہے جو وعدۂ وصال آج بھی اے خدا سمجھ

نے سرِ برگِ آرزو۔ نے رہ و رسمِ گفتگو
اے دل و جانِ خلق تو ہمکو بھی آشنا سمجھ

لغزشِ پا کو ہے بلد نغزۂ یا علی مدد
ٹوٹے گر آئینۂ اسد سبحہ کو خوں بہا سمجھ

[1] پہلے متن میں یہ مصرع یوں تھا
"کہتے ہیں اہلِ گفتگو کچھ نہ سمجھ فنا سمجھ"

جوشِ دل ہے نشہ ہائے فطرتِ بیدل نہ پوچھ
قطرہ ہی میخانہ ہے دریائے بے ساحل نہ پوچھ

پہن گشتنہائے دل بزمِ نشاطِ گرد باد
لذتِ عرضِ کشادِ عقدۂ مشکل نہ پوچھ

آبلہ پیمانۂ اندازۂ تشویش تھا
اے دماغِ نارسا خمخانۂ منزل نہ پوچھ

نے صبا بال پری ۔ نے شعلہ سودائے جنوں
شمع سے جز عرضِ افسونِ گدازِ دل نہ پوچھ

یک مژہ برہم زدن حشرِ دو عالم فتنہ ہے
یاں سراغِ عافیت جز دیدۂ بسمل نہ پوچھ

بزم ہے یک پنبۂ مینا گداز ربط سے
عیش کر غافل حجابِ نشۂ محفل نہ پوچھ

ہاں تخلص جامۂ شنگرفی ارزانی اسد
شاعری جز سازِ درویشی نہیں حاصل نہ پوچھ

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب ۔ دل نہ سمجھ بلا سمجھ

ریگِ رواں و مرتپش درسِ تسلیِ شعلہ
آئینہ طورِ اے خیال جلوہ کو خوں بہا سمجھ

وحشتِ دردِ بیکسی بے اثر اس قدر نہیں
رشتۂ عمرِ خضر کو نالۂ نارسا سمجھ

شوقِ عنانگسل اگر درسِ جنوں ہوس کرے
جادۂ سیرِ دو جہاں یک مژہ خواب پا سمجھ

گاہ بہ خلد امیدوار ۔ گہ بہ جحیم بیمناک
گرچہ خدا کی یاد ہے کلفتِ ماسوا سمجھ

اے بسراب حسنِ خلق تشنۂ سعیِ امتحاں
شوق کو منفعل نہ کر ناز کو التجا سمجھ

شوخیِ حسن و عشق ہے آئینہ دارِ ہمدگر
خار کو بے نیامِ جاں ۔ ہم کو برہنہ پا سمجھ

حیرت حدِ اقلیمِ تمنائے پری ہے
آئینہ بہ آئینِ گلستانِ ارم باندھ

یا مردیک انداز نہیں قامتِ ہستی
طاقت اگر اعجاز کرے تہمتِ خم باندھ

دیباچۂ وحشت ہے اسد شکوۂ خوباں
خوں کردلِ اندیشہ و مضمونِ ستم باندھ

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ
ورنہ ہے چرخ و زمیں یک ورقِ گرداندہ

میکدے میں ز دلِ افسردگیِ بادہ کشاں
موجِ مے مثلِ خطِ جام ہے ہرجا ماندہ

خواہشِ دل ہے زباں کو سببِ گفت بیاں
ہے سخن گرد ز دامانِ ضمیر افشاندہ

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

حیف بے حاصلیِ اہلِ ریا پر **غالب**
یعنی ہیں ماندہ ز آں سو و ازیں سو راندہ

بسکہ مے پیتے ہیں اربابِ فنا پوشیدہ
خطِ پیمانۂ مے ہے نفسِ دزدیدہ

بہ غرورِ طرحِ قامت و رعنائیِ سرو
طوق ہے گردنِ قمری میں رگِ بالیدہ

کی ہے وا اہلِ جہاں نے بہ گلستانِ جہاں
چشمِ غفلت نظرِ شبنمِ خورنادیدہ

یاس آئینۂ پیدائیِ استغنا ہے
ناامیدی ہے پرستارِ دلِ رنجیدہ

واسطے فکرِ مضامینِ متیں کے **غالب**
چاہیے خاطرِ جمع و دلِ آرامیدہ

پرواز یک تپِ غمِ تسخیرِ نالہ ہے — گرمیِ نبضِ خار و خسِ آشیاں نہ پوچھ

توشیحِ بازگردِ دلِ پروانہ ہے بہار — بیتابیِ تجلیِ آتش بجاں نہ پوچھ

غفلت متاعِ کفۂ میزانِ عدل ہوں — یا رب حسابِ سختیِ خوابِ گراں نہ پوچھ

ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے[لہ] — عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوزِ دل[لہ] — دردِ جدائیِ اسداللہ خاں نہ پوچھ

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غمکدہ[عہ] — جس کی بہار یہ ہو پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اُٹھائیے — دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

(۲)

رفتار سے شیرازۂ اجزائے قدم باندھ — اے آبلہ! محمل پئے صحرائے عدم باندھ

بیکاریِ تسلیم بہر رنگِ چمن ہے — گر خاک ہو گلدستۂ صد نقشِ قدم باندھ

اے جادہ! بہ سر رشتۂ یک ریشہ دویدن — شیرازۂ صد آبلہ جوں سبحہ بہم باندھ

لہ یہ دونوں شعر بھی مذکورہ بالا دیوانوں کے آخر میں موجود ہیں۔ لیکن مقطع کا مصرع اول یوں ہے۔
کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ آہ

عہ اس غزل کے ہم طرح فقط یہ دو شعر دو دیوانوں میں ملتے ہیں۔ ان میں سے پہلا شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر بھی درج ہے نایاب دوسرا شعر اور بھی بعد کا کہا ہوا ہے۔
سوا ان دو شعروں کے اس غزل کا ہم طرح کوئی شعر مطبوعہ دیوانوں میں نہیں پایا جاتا۔

ردیف

"ہ"

(۱)

قلمی

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

حیرت ہجومِ لذتِ غلطانیِ تپش
سیماب بالش و کمرِ دل ہے آئینہ

غفلت بہ بالِ جوہرِ شمشیر پُرفشاں
یاں پشت چشمِ شوخیِ قاتل ہے آئینہ

حیرت نگاہِ برقِ تماشا بہارِ شوخ
در پردہ ہوا پرِ بسمل ہے آئینہ

یاں رہ گئے ہیں ناخنِ تدبیر ٹوٹ کر
جوہر طلسمِ عقدۂ مشکل ہے آئینہ

ہم زانوئے تامل و ہم جلوہ گاہِ گل
آئینہ بندِ خلوت و محفل ہے آئینہ

دل کارگاہِ فکر و اسد بینوائے دل
یاں سنگِ آستانۂ بیدل ہے آئینہ

تی

جز دل سراغِ دردِ بدل خفتگاں نہ پوچھ
آئینہ عرض کر خط و خالِ بیاں نہ پوچھ

ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا[1]
سامانِ بادشاہیِ وصلِ بتاں نہ پوچھ

[1] یہ دیوانِ غالب مطبوعہ مولانا نظامی بدایونی و مولانا حسرت موہانی کے آخر میں اشعار غیر مروجہ کی ضمن میں موجود ہے مگر اس میں مصرع ثانی یوں ہے

جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟

عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی"

بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو۔ پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو **غالب**

ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے۔ ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا، لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی۔ وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی، کہاں کا عشق۔ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو۔ تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ۔ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو۔ کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو - مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یارب - اور مرا بادشاہ ہو

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو - تو کیونکر ہو

تمہیں کہو - کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

بتاؤ اس مژہ کو دیکھکر ہو مجھکو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

مجھے جنوں نہیں غالب - ولے بقولِ حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ و لیکن ناچار
پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا۔ یعنی
ہوسِ سیر و تماشا۔ سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ۔ کششِ کافِ کرم ہے ہمکو

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھکو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

ابھرا ہوا نقاب میں ہے انکے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

نوٹ مولانا حسرت موہانی اور مولوی نظامی بدایونی کے مطبوعہ دیوانوں کے آخر میں غیر مطبوعہ اشعار کی ضمن میں اس غزل کا ایک یہ شعر بھی درج ہے۔

ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہمکو

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں — ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ — ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور — تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ — ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف — اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پاؤں

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں — دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پاؤں

غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

واں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار — یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم کو دیکھ
آئینہ تا کہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

واں پہنچ کر جو غش آتا پے ہم ہے ہم کو — صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے — کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو

ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن — تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو — یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو
خوشی کیا۔ کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو
وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانے میں۔ تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو
شہادت تھی مری قسمت میں۔ جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو
نہ لٹتا دن کو۔ تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا۔ دعا دیتا ہوں رہزن کو
سخن کیا کہہ نہیں سکتے؟ کہ جویاں ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے۔ کہ کھودیں جا کے معدن کو
مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی- بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر- نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی؟
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اُس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

قفس میں ہوں- گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نواسنجانِ گلشن کو

نہیں گر ہمدمی آساں- نہ ہو- یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا- آرزوئے دوست دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو- اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو- کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو- کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

ہوں سخت جانِ کاوشِ فکرِ سخن اسدؔ
تیشے کے کوہسار میں ہے یک صدا گرو

(۴۳)

کعبہ میں جا رہا۔ تو نہ دو طعنہ۔ کیا کہیں
بھولا ہوں۔ حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو؟

طاعت میں۔ تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈالدو کوئی لیکر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے؟
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

غالبؔ۔ کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے۔ اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

لہ
وارستہ اِس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار۔ نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھکو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

؎ یہ وہ غزلیں ہیں کہ جن کا ہم طرح کوئی شعر قلمی نسخے میں نہیں ہے۔ لہ یہ غزل بجنسہ قلمی نسخے کے حاشیے پر تحریر ہے

گردِ ساحل ہے نمِ شرمِ جبینِ آشنا
گر نہ باندھے قلزمِ الفت میں سرجا کدو

گرمیِ شوقِ طلب ہے عین تا پاکِ وصال
غافلاں آئینہ داں ہے نقشِ پائے جستجو

رہن خاموشی میں ہے آرائشِ بزمِ وصال
ہے پرِ پروازِ رنگِ رفتۂ خوں گفتگو

ہے تماشا حیرت آبادِ تغافل ہائے شوق
یک رگِ خوابِ سراسر جوشِ خونِ آرزو

خوے شرمِ سرد بازاری ہے سیلِ خانماں
ہے اسد نقصاں میں مفت ورصبا طریو

رنگِ طرب ہے صورتِ عہدِ وفا گرو
تھا کس قدر شکستہ کہ ہے جا بجا گرو

پروازِ نقدِ دامِ تمنائے جلوہ تھا
طاؤس نے اک آئینہ خانہ رکھا گرو

عرضِ بساطِ انجمنِ رنگ مفت ہے
موجِ بہار رکھتی ہے اک بوریا گرو

ہر ذرہ خاک عرضِ تمنائے رفتگاں
آئینہ شکستہ و تمثالما گرو

ہے تاک میں سلم ہوسِ صد قدحِ شراب
تسبیحِ زاہداں بہ کفِ مدعا گرو

برقِ آبیارِ فرصتِ رنگِ دمیدہ ہوں
جوں نخلِ شمع ریشہ میں نشو و نما گرو

طاقت بساطِ دستگہِ یک قدم نہیں
جوں اشک جب تلک نہ رکھوں دست و پا گرو

ہے وحشتِ جنونِ بہار اسقدر کہ ہے
بالِ پری بہ شوخیِ موجِ صبا گرو

بیتابِ سیرِ دل ہے سرِ ناخنِ نگار
یاں نعل ہے بہ آتشِ رنگِ حنا گرو

مژگاں خلیدۂ رگِ ابرِ بہار ہے
نشتر بہ مغزِ پنبۂ مینا فرو نہ ہو

عرضِ نشاطِ دید ہے مژگانِ انتظار
یارب! کہ خارِ پیرہنِ آرزو نہ ہو

واں پرفشانِ دامِ نظر ہوں جہاں اسدؔ
صبحِ بہار بھی قفسِ رنگ و بو نہ ہو

مبادا بے تکلف فصل کا برگِ نوا گم ہو
مگر طوفان سے پیچشِ موجِ صبا گم ہو

سبک وارستگاں کو تنگِ ہمت ہے خداوندا!
اثر سرمے سے اور لبہائے عاشق سے صدا گم ہو

نہیں جز دردِ تسکینِ نکوہش ہائے بیدرداں
کہ موجِ گریہ میں صد خندۂ دنداں نما گم ہو

ہوئی ہے ناتوانی بیدماغِ شوخیٔ مطلب
جبیں میں۔ در لباسِ سجدہ اے دستِ دعا گم ہو

تجھے ہم مفت دیویں یک جہاں چینِ جبیں لیکن
مبادا بے حجابِ طبعِ نقشِ مدعا گم ہو

بلا گردانِ تمکینِ بتاں۔ صد موجۂ گوہر
عرق بھی جن کے عارض پر بہ تکلیفِ حیا گم ہو

اٹھاوے کب وہ جانِ خرمِ تہمتِ قتلِ عاشق کی
کہ جس کے ہاتھ میں مانندِ خونِ رنگِ حنا گم ہو

کریں خوباں جو سیرِ حسنِ اسدؔ یک پردہ نازک تر
دمِ صبحِ قیامت در گریبانِ قبا گم ہو

خشکیٔ مے نے تلف کی میکدے کی آبرو
کاسۂ دریوزہ ہے پیمانۂ دستِ سبو

بہرِ جاں پروردنِ یعقوب۔ بالِ خاک سے
وام لیتے ہیں پرِ پروانہ۔ پیراہن کی بو

نہ دیکھیں وے یک دل سرد غیر از شمع کافوری
خدایا اس قدر بزم اسدؔ گرم تماشا ہو

(۳)

عہ
اگر وہ آفتِ نظارہ جلوہ گستر ہو
ہلال۔ ناخنکِ یدہ ہائے اختر ہو

بہ یادِ قامت اگر ہو بلند آتشِ غم
ہر ایک داغِ جگر۔ آفتابِ محشر ہو

ستم کشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا
اب اس سے ربط کروں جو بہت ستمگر ہو

عجب نہیں ہے تحریرِ حالِ گریۂ چشم
بروئے آب۔ جوہرِ موج نقشِ سطر ہو

امیدوار ہوں تاثیرِ تلخکامی سے
کہ قندِ بوسۂ شیریں لباں مکرر ہو

صدف کی ہے ترے نقشِ قدم میں کیفیت
سرشکِ چشم اسدؔ کیوں نہ اس میں گوہر ہو

بے درد سر بسجدۂ الفت فرو نہ ہو
جوں شمع۔ غوطہ داغ میں کھا۔ گر وضو نہ ہو

دل دے کفِ تغافلِ ابروئے یار میں
آئینہ ایسے طاق پہ گم کر کہ تو نہ ہو

زلفِ خیال نازک و اظہار بیقرار
یارب! بیان شانہ کشِ گفتگو نہ ہو

تمثالِ ناز جلوۂ نیرنگِ اعتبار
ہستی عدم ہے آئینہ گر روبرو نہ ہو

عہ یہاں سے ردیف " و " کی وہ غزلیں شروع ہوئی ہیں جنکا ہیچ کوئی شعر مطبوعہ دیوانوں میں موجود نہیں

ردیف

"و"

(۱)[1]

حسد پیمانہ سے دل عالمِ آبِ تماشا ہو (قلمی)
حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو (م)
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

بہم بالیدنِ سنگ و گلِ صحرا یہ چاہے ہے
کہ تارِ جادہ بھی کہسار کو زنارِ مینا ہو

حریفِ وحشتِ نازِ نسیمِ عشق جب آؤں
کہ شکلِ غنچہ سازِ یک گلستاں دل مہیا ہو

بجائے دانہ خرمن یک بیاباں بیضۂ قمری
مرا حاصل وہ نسخہ ہے کہ جس سے خاک پیدا ہو

کرے کیا سازِ بینش وہ شہیدِ درد[2] آگاہی
جسے موئے دماغِ بیخودی خوابِ زلیخا ہو

بقدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوقِ[3] معاصی بھی (م)
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

دلِ چوں شمع بہرِ دعوتِ نظارہ لا یعنی
نگہ لبریزِ اشک و سینہ معمورِ تمنا ہو

اگر وہ سروِ جاں بخش خرامِ اہتزاز آوے
اگر وہ سرو قد گرمِ خرامِ ناز آ جاوے (م)
کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

---

[1] اس ردیف میں صرف یہی ایک غزل ہے جس کے تین شعر اختلافِ خفیف قلمی اور مطبوعہ دیوان میں مشترک ہیں۔ باقی کی غزلیں دونوں میں بالکل الگ الگ ہیں۔
[2] متن میں پہلے "شہید درد" کی جگہ "تماشا رنج" تھا۔
[3] پہلے "ذوق" کی جگہ "عیش" تھا۔

جس کو ہو جان و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں؟

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟

روئیے زار زار کیا۔ کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

دل ہی تو ہے۔ نہ سنگ و خشت۔ درد سے بھر نہ آئے کیوں؟

روئیں گے ہم ہزار بار۔ کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

دَیر نہیں۔ حرم نہیں۔ در نہیں۔ آستاں نہیں

بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم۔ غیر کوئی اٹھائے کیوں؟

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز

آپ ہی ہو نظارہ سوز۔ پردے میں منہ چھپائے کیوں؟

دشنۂ غمزہ۔ جانستاں۔ ناوکِ ناز۔ بے پناہ

تیرا ہی عکسِ رُخ سہی۔ سامنے تیرے آئے کیوں؟

قیدِ حیات و بندِ غم۔ اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی۔ غم سے نجات پائے کیوں؟

حسن اور اس پہ حسنِ ظن۔ رہ گئی بوالہوس کی شرم

اپنے پہ اعتماد ہے۔ غیر کو آزمائے کیوں؟

واں وہ غرورِ عز و ناز۔ یاں یہ حجابِ پاسِ وضع

راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں؟

ہاں وہ نہیں خدا پرست۔ جاؤ وہ بے وفا سہی

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو۔ جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر۔ ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل رہگذر میں خاک نہیں

بھلا اسے نہ سہی۔ کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانہ کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر۔ گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب؟
یاد تھیں جتنی دعائیں۔ صرفِ درباں ہو گئیں

جانفزا ہے بادہ۔ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں!
دیکھنا اِن بستیوں کو تم۔ کہ ویراں ہو گئیں

دیوانگی سے دوش پہ زُنّار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا اگر تِرا نہیں آساں۔ تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت۔ بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

قید میں یعقوب نے لی گو۔ نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھونگا۔ کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

اِن پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے دماغ اُسکا ہے۔ راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا۔ گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سنکر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے

دایم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں؟
خاک ایسی زندگی پہ، کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جاے دل؟
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب! زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟
رتبے میں ماہ و مہر سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھکو منعِ قدمبوس کس لئے؟
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالب وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی؟ جو پنہاں ہوگئیں

یاد تھیں ہمکو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی جو عریاں ہوگئیں

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زبانی کارگر
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو۔ کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو۔ کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم۔ اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

نہیں۔ کہ مجکو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے"
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو۔ تو خیر باد نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
"کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم۔ ہمیں کیا کام؟
دیا ہے ہمکو خدا نے وہ دل۔ کہ شاد نہیں

تم اُن کے وعدہ کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب
یہ کیا؟ کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں"

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا۔ شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریِ عشرتگہِ خسرو کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکونامیِ فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج۔ کم از سیلیِ اُستاد نہیں

وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے
گر چراغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں؟

سبدِ گُل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیّاد نہیں

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن۔ اُنکو دمِ ایجاد نہیں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اسقدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں؟

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ بزم میں؟
ہو غم ہی جانگداز۔ تو غمخوار کیا کریں

جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

میں جو کہتا ہوں "کہ ہم لیں گے قیامت میں تمھیں"
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں "کہ ہم حور نہیں"

ظلم کر ظلم - اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پہ ہزار بار
اے کاش جانتا نہ ترے رہگذر کو میں

ہے کیا جو کس کے باندھئے۔ میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

لو۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر۔ تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالبؔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

ہے تجلی تری سامانِ وجود — ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے — ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے — غمِ محرومیِ جاوید نہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہمکو جینے کی بھی امید نہیں

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں — کافر ہوں۔ گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں — شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا۔ پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر — آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکرِ وفا ہو فریب اُس پہ کیا چلے — کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں؟

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے — ڈالا ہے تمکو وہم نے کس پیچ و تاب میں؟

میں۔ اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے — جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے — ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ۔ ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ۔ ایک بگڑنا عتاب میں

جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں
قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے۔ نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
لے گئی۔ ساقی کی نخوت۔ قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں
ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمو
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں
تھی وطن میں شان کیا غالبؔ۔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں۔ وہ مشتِ خس۔ کہ گلخن میں نہیں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں
ضعف سے طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھکو۔ ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

آبرو کیا خاک اُس گُل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن - جو دامن میں نہیں
ضعف سے اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اُڑ گیا - جو خوں - کہ دامن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں
کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم - اندھیر ہے -
پنبہ - نورِ صبح سے کم - جس کے روزن میں نہیں
رونقِ ہستی ہے - عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے - گر برق خرمن میں نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں
بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے

دیکھئے مت چشمِ کم سے سوئے ضبطِ افسردگاں
جوں صدف پر گوہر ہیں دنداں در جگر افسردگاں

گرمِ تکلیفِ دلِ رنجیدہ ہے ازبسکہ چرخ
قرصِ کافوری ہے بہرِ جانِ سرما خوردگاں

رنجشِ دل یک جہاں ویراں کریگا ناگہے
دشت ساماں ہے غبارِ خاطرِ افسردگاں

ہاتھ پر ہو ہاتھ تو درسِ تاسف ہی سہی
شوقِ مفتِ زندگی ہے ہائے غفلت مردگاں

خار سے گل سینہ افگارِ جفا ہے اے اسدؔ
برگریزی ہے پریشانیِ ناوک خوردگاں

مطلع (۳)

نا وفا ہے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو۔ اہلِ نظر۔ قبلہ نما کہتے ہیں

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے۔ ہم مہرِ گیا کہتے ہیں

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائیگا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

دیکھئے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اُس کی ہر بات پہ ہم۔ نامِ خدا کہتے ہیں

ہ یہاں سے ردیف ن کی وہ غزلیں شروع ہوئی ہیں جنکا بجز مطلع کوئی شعر قلمی دیوان میں نہیں ہے۔

ہو چکے ہم جادہ ساں صد بار قطع وتا ہنوز
زینتِ یک پیرہن جوں دامنِ صحرا نہیں

ہو سکے بے پردہ جوشیدنِ خونِ جگر
اشک بعدِ ضبط غیر از پنبۂ مینا نہیں

ہو سکے کب تہمتِ دل مانعِ طوفانِ اشک
گردِ ساحل سنگِ راہِ جوششِ دریا نہیں

ہے طلسمِ دہر میں صد حشرِ پاداشِ عمل
آگہی غافل کہ یک امروز بے فردا نہیں

بسمل ہیں تیغِ دو دستی کا نہیں بچتا اسد
عافیت بیزار اشغلِ کعبتین اچھا نہیں

ضبط سے مطلب بجز وارستگی دیگر نہیں
دامنِ تمثال آبِ آئینہ سے تر نہیں

لہ ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں

باعثِ ایذا ہے برہم خوردنِ بزمِ سرور
لخت لختِ شیشۂ بشکستہ جز نشتر نہیں

واں سیاہی مردمک ہے اور یاں داغِ شراب
مہ حریفِ نازشِ ہم چشمیِ ساغر نہیں

ہے فلک بالا نشینِ فیضِ خم گردیدنی
عاجزی سے ظاہرا رتبہ کوئی برتر نہیں

دل کو اظہارِ سخن اندازِ فتح الباب ہے
یاں صریرِ خامہ غیر از اصطکاکِ در نہیں

کب تلک پھیرے اسد لبہائے تفتہ پر زباں
طاقتِ لب تشنگی اے ساقیِ کوثر نہیں

لہ یہ مصرع متن میں پہلے یوں تھا۔ "ہوتے ہیں بے قدر در کنجِ وطن صاحب دلاں"

سپند آہنگیِ ہستی و سعیِ نالہ فرسائی
غبار آلودہ ہیں جوش و شمع کشتہ تقریریں

درشتیِ تامل پنبۂ گوشِ حریفاں ہے
وگرنہ خواب کی مضمر ہیں افسانے میں تعبیریں

بتانِ شوخ کی تمکینِ بعد از قتل کی حیرت
بیاضِ دیدۂ نخچیر پر کھینچے ہے تصویریں

اسد طرزِ عروجِ اضطرابِ دل کو کیا کہیے
سمجھتا ہوں تپش کو الفتِ قاتل کی تاثیریں

بیدماغی حیلہ جوئے ترکِ تنہائی نہیں
ورنہ کیا موجِ نفس زنجیرِ رسوائی نہیں

وحشیِ خو کردۂ نظارہ ہے حیرت جسے
حلقۂ زنجیر جز چشمِ تماشائی نہیں

قطرہ کو جوشِ عرق کرتا ہے دریا دستگاہ
جز حیا پرکارِ سعیِ بے سروپائی نہیں

چشمِ نرگس میں نمک بھرتی ہے شبنم سے بہار
فرصتِ نشو و نما سازِ شکیبائی نہیں

کس کو دوں یارب حسابِ نازکیہائے دل
آمد و رفتِ نفس جز شغلِ پیمائی نہیں

مت رکھ اے انجام غافل سازِ ہستی بے غرور
مور کے پر میں سر و برگِ خود آرائی نہیں

سایۂ افتادگی بالین و بستر ہوں اسد
جوں صنوبر دل سراپا قامت آرائی نہیں

ظاہرا سرپنجۂ افتادگاں گیرا نہیں
ورنہ کیا دامان کے حسرت پہ نقشِ پا نہیں

آنکھیں پتھرائی ہیں نامحسوس ہے تارِ نگاہ
ہے زمیں از بسکہ سنگیں جادہ بھی پیدا نہیں

ہوا ہے گریۂ بیباک ضبط سے تسبیح
بساطِ چشمکی ہیں برنگِ ریگِ رواں
ہزار دل پہ ہم اک اختیار رکھتے ہیں
ہزار دل بہ وداعِ قرار رکھتے ہیں

جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے غالبؔ
بسانِ دشت دلِ پُر غبار رکھتے ہیں

بہ غفلت عطرِ گل ہم آگہی مخمور ملتے ہیں
چراغانِ تماشا چشمِ صد ناسور ملتے ہیں
رہا کس جرم سے ہیں بیقرارِ داغ ہم طرحی
سمندر کو پرِ پروانے کا فور ملتے ہیں
چمن نامحرمِ آگاہیِ دیدارِ خوباں ہے
سحر گلہائے نرگس چند چشمِ کور ملتے ہیں
کجا جوہر چہ عکسِ خطِ بتاں وقتِ خود آرائی
دلِ آئینہ زیرِ پائے خیلِ مور ملتے ہیں
تماشائے بہارِ آئینہ پروازِ تسکیں ہے
کفِ گلبرگ سے پائے دلِ رنجور ملتے ہیں
گرانجانی سبکسارو تماشا بدماغ آیا
کفِ افسوسِ فرصت سنگِ کوہِ طور ملتے ہیں

اسد حیرت کشِ یک داغِ مشک آلودہ ہے یارب
لباسِ شمع پر عطرِ شبِ دیجور ملتے ہیں

ہوئی ہیں آب شرمِ کوششِ بیجا سے تدبیریں
عرق ریزِ تپش ہیں موج کی مانند زنجیریں
خیالِ سادگیہائے تصور نقشِ حیرت ہے
پرِ عنقا پہ رنگِ رفتہ سے کھینچی ہیں تصویریں
زبس ہر شمع یاں آئینۂ حیرت پرستی ہے
کرے ہیں غنچۂ منقارِ طوطی نقشِ گل گیریں

قالِ ہستی خارِ خارِ وحشتِ اندیشہ ہے
شوخیٔ سوزن ہے ساماں پیرہن کی فکر میں

غفلتِ دیوانہ جز تمہیدِ آگاہی نہیں
مغزِ سر خوابِ پریشاں ہے سخن کی فکر میں

مجھ میں اور مجنوں میں وحشت سازِ دعوے ہے اسدؔ
برگ برگِ بید ہے ناخن زدن کی فکر میں

اے نوا سازِ تماشا سر بکف جلتا ہوں میں
اک طرف جلتا ہے دل اور اک طرف جلتا ہوں میں

شمع ہوں لیکن بہ پا در رفتہ خارِ جستجو
مدعا گم کردہ ہر سو ہر طرف جلتا ہوں میں

ہے مساسِ دستِ افسوس آتش انگیزِ تپش
بے تکلف آپ پیدا کرکے تف جلتا ہوں میں

ہے تماشا گاہِ سوزِ تازہ ہر یک عضوِ تن
جوں چراغانِ دیوالی صف بصف جلتا ہوں میں

شمع ہوں تو بزم میں جا پاؤں غالبؔ کی طرح
بے محل اے مجلس آرائے نجف جلتا ہوں میں

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
برنگِ جادہ سر کوئے یار رکھتے ہیں

برہنہ مستیِ صبحِ بہار رکھتے ہیں
جنونِ حسرتِ یک جامہ وار رکھتے ہیں

طلسمِ مستیِ دل آں سوئے ہجومِ سرشک
ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں

ہمیں حریرِ شرربافِ سنگ خلعت ہے
یہ ایک پیرہنِ زرنگار رکھتے ہیں

نگاہِ دیدۂ نقشِ قدم ہے جادۂ راہ
گزشتگاں اثرِ انتظار رکھتے ہیں

میرا نیاز و عجز ہے صفتِ بتاں اسدؔ
یعنی کہ بندۂ بہ درم ناخریدہ ہوں

بقدرِ لفظ و معنی فکرت احرامِ گریباں ہے
وگرنہ کیجے جو ذرہ عریاں ہم نمایاں ہیں

عروجِ نشۂ واماندگی پیمانہ محمل تر
برنگِ ریشۂ تاک آبلے جادے میں پنہاں ہیں

بوحشت گاہِ امکاں اتفاقِ چشم مشکل ہے
مہ و خورشید باہم سازِ یک خوابِ پریشاں ہیں

نہ انشا معنیِ مضموں نہ املا صورتِ موزوں
عنایت نامہائے اہلِ دنیا ہرزہ عنواں ہیں

طلسمِ آفرینش حلقۂ یک بزمِ ماتم ہے
زمانے کی شبِ یلدا سے موئے سر پریشاں ہیں

یہ کس ناہید کی تمثال کا ہے جلوہ سیمابی
کہ مثلِ ذرہ ہائے خاک آئینے پرافشاں ہیں

مگر آتش ہمارا کوکبِ اقبال چمکا دے
وگرنہ مثلِ خارِ خشک۔ مردودِ گلستاں ہیں

اسدؔ بزمِ تماشا میں تغافل پردہ داری ہے
اگر ڈھانپے تو آنکھیں ڈھانپ ہم تصویرِ عریاں ہیں

مرگِ شیریں ہو گئی تھی کوہکن کی فکر میں
تھا حریرِ سنگ سے قطعِ کفن کی فکر میں

وحشتِ یک چشمِ حیرت ششِ جہت آغوش ہے
ہوں سپند آسا وداعِ انجمن کی فکر میں

وہ غریبِ دشت آبادِ تسلی ہوں جسے
کوچہ دے ہے زخمِ دل صبحِ وطن کی فکر میں

سایۂ گل داغ و جوشِ نکہتِ گل موجِ دود
رنگ کی گرمی ہے تاراجِ چمن کی فکر میں

ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں
جوں شانہ پشتِ دست بدنداں گزیدہ ہوں

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

دیتا ہوں کشتگاں کو سخن سے سرِ تپش
مضرابِ تارہائے گلوئے بریدہ ہوں

ہے جنبشِ زباں مجھ بن سخت ناگوار
خوں نابہ ہائے اہلِ حسرت چشیدہ ہوں

جوں بوئے گل ہوں گرچہ گرانبارِ پشتِ زر
لیکن اسدؔ بوقتِ گزشتن جریدہ ہوں

خوں در جگر نہفتہ بہ زردی رسیدہ ہوں
خود آشیانِ طائرِ رنگِ پریدہ ہوں

ہے دست رو بسیرِ جہاں بستنِ نظر
پائے ہوس بہ دامنِ مژگاں کشیدہ ہوں

ہیں چشم واکشادہ و گلشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنمِ خورشید دیدہ ہوں

تسلیم سے یہ نالۂ موزوں ہوا حصول
اے بے خبر! میں نغمۂ چنگِ خمیدہ ہوں

پیدا نہیں ہے اصلِ تگ و تازِ جستجو
مانندِ موجِ آب زبانِ بریدہ ہوں

سر پر مرے وبالِ ہزار آرزو رہا
یا رب میں کس غریب کا بختِ رمیدہ ہوں

میں بے ہنر کہ جوہرِ آئینہ تھا عبث
پائے نگاہِ خلق میں خارِ خلیدہ ہوں

ف یہ دونو شعر مولانا حسرت موہانی اور مولانا نظامی کے مطبوعہ دیوانوں کے آخر میں غیر مرجّح اشعار کے ضمن میں درج ہیں ان میں سے دوسرا شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر لکھا ہوا ہے متن میں نہیں ہے۔

پیمانۂ وسعت کدۂ شوق ہوں اے رشک
محفل سے مگر شمع کو دل تنگ نکالوں

گر ہو بلدِ شوق مری خاک کو وحشت
صحرا کو بھی گھر سے کئی فرسنگ نکالوں

فریاد اسد غفلتِ رسوائی دل سے
کس پردے میں فریاد کی آہنگ نکالوں

کس ضعف میں امید کو دل تنگ نکالوں
میں خار ہوں آتش میں چھبوں رنگ نکالوں

ے کوچہ رسوائی و زنجیر پریشاں
ے نالہ میں کس پردے میں آہنگ نکالوں

یک نشو و نما جا نہیں جولانِ ہوس کو
ہر چند بمقدارِ دلِ تنگ نکالوں

یک جلوۂ خورشید خریدارِ وفا ہو
جوں ذرۂ صد آئینہ بیرنگ نکالوں

و فسردہ تمکیں ہے نفس گرمیِ احباب
پھر شیشے سے عطرِ شررِ سنگ نکالوں

ضعف آئینہ پروازیِ دستِ دگراں ہے
تصویر کے پردے میں مگر رنگ نکالوں

ہے غیرتِ الفت کہ اسد اس کی ادا پر
گر دیدہ و دل صلح کریں جنگ نکالوں

سودائے عشق سے دمِ سرد کشیدہ ہوں
شامِ خیالِ زلف سے صبح دمیدہ ہوں

دوراں سرے گردشِ ساغر ہے متصل
خمخانۂ جنوں میں دماغ رسیدہ ہوں

کی متصل ستارہ شماری میں عمر صرف
تسبیحِ اشکہائے زمژگاں چکیدہ ہوں

حیرت کشِ یک جلوۂ معنی ہیں نگاہیں — مطلع — کھینچوں ہوں سویدائے دلِ چشم سے آہیں

مطبوعہ

مستِ مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

تن بہ بندِ ہوس در ندادہ رکھتے ہیں — دلِ زکارِ جہاں اوفتادہ رکھتے ہیں
تمیز زشتی و نیکی میں لاکھ باتیں ہیں — بہ عکسِ آئینہ یک فردِ سادہ رکھتے ہیں
برنگِ سایہ ہمیں بندگی میں ہے تسلیم — کہ داغِ دل بہ جبینِ گشادہ رکھتے ہیں
بہ زاہداں رگِ گردن ہے رشتۂ زنار — کہ یہ بپائے بتے نانہادہ رکھتے ہیں
معافِ بیہودہ گوئی ہیں ناصحانِ عزیز — دلے بہ دستِ نگارے ندادہ رکھتے ہیں
برنگِ سبزہ عزیزانِ بدزباں یکدست — ہزار تیغ بہ زہرآب دادہ رکھتے ہیں

م

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

(۲)

طاؤس نمط داغ کے گر رنگ نکالوں — یک فردِ نسب نامۂ نیرنگ نکالوں
کو تیزیِ رفتار کہ صحرائے زمیں کو — جوں قمریِ بسمل تپش آہنگ نکالوں
دامانِ شفق طرفِ نقابِ مہِ نو سے — ناخن کو جگرکاوی میں بیرنگ نکالوں
کیفیتِ دیگر ہے فشارِ دلِ خونیں — یک غنچے سے صد خمِ مے گلرنگ نکالوں

لہ ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن — قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن

تیری آرائش کا استقبال کرتی ہے بہار — جوہرِ آئینہ ہے یاں نقشِ احضارِ چمن

م برشکالِ دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے — کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن

بسکہ پائی یار کی رنگیں ادائی سے شکست — ہے کلاہِ نازِ گل برطاقِ دیوارِ چمن

م الفتِ گل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی — سرو ہے با وصفِ آزادی گرفتارِ چمن

وقت ہے گر بلبلِ مسکیں زلیخائی کرے — یوسفِ گل جلوہ فرما ہے بہ بازارِ چمن

وحشت افزا گریہ ہا موقوفِ فصلِ گل اسدؔ
چشمِ دریا ریز ہے میزابِ سرکارِ چمن

قل جوں مردمکِ چشم سے ہوں جمع نگاہیں — خوابیدہ بہ حیرت کدۂ داغ ہیں آہیں

پھر حلقۂ کاکل میں پڑیں دید کی راہیں — جوں دود فراہم ہوئیں روزن میں نگاہیں

پایا سرِ ہر ذرہ جگر گوشۂ وحشت — ہیں داغ سے معمور شقایق کی کلاہیں

کس دل پہ ہے عزمِ صفِ مژگانِ خود آرا — آئینہ کی پایاب سے اتری ہیں سپاہیں

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا — واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

یہ مطلع اسدؔ جوہرِ افسونِ سخن ہو — گر عرض تپاکِ جگرِ سوختہ چاہیں

لہ یہ شعر مولانا حسرت موہانی اور مولانا نظامی بدایونی کے مطبوعہ دیوانوں کے آخر میں غیر مروجہ اشعار کی ذیل میں موجود ہے

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے | م | ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
حسنِ افسردہ دلی ہا رنگیں | | شوق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
تیرے بیمار پہ ہیں فریادی | | وہ جو کاغذ میں دوا باندھتے ہیں
قید میں بھی ہے اسیری آزاد | | چشمِ زنجیر کو وا باندھتے ہیں
شیخ جی کعبہ کا جانا معلوم | | آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں
کس کا دل زلف سے بھاگا کہ اسدؔ | | دستِ شانہ بہ قفا باندھتے ہیں

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں | م قلمی | ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر | م | برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم | م | اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل | م | مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ | م | لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں | م | آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خوباں کہ اسدؔ | |
سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ | م | ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

صاف ہے از بسکہ عکسِ گل سے گلزارِ چمن | قلمی | جانشینِ جوہرِ آئینہ ہے خارِ چمن

تماشا کردنی ہے لطفِ زخمِ انتظار اے دل
سویدا داغِ مرہم مردمک ہے چشمِ سوزن میں

دل و دین و خرد تاراجِ نازِ جلوہ پیرائی
ہوا ہے جوہرِ آئینہ خیلِ مور خرمن میں

ہوئی تقریبِ منعِ شوقِ دیدن خانہ ویرانی
ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
م
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

نکوہش مانعِ دیوانگی ہائے جنوں آئی
لگایا خندۂ ناصح نے بخیہ جیب و دامن میں

اسد زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں
م
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں مدا
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے م ۱ ہر قطرہ خوں تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پرافشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرہ روزن میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

پاؤں میں جب وہ حنا باندھتے ہیں تحی
میرے ہاتھوں کو جدا باندھتے ہیں

جنبشِ دل سے ہوئے ہیں عقدہ ہائے کار وا
کمتریں مزدورِ سنگیں دست ہے فرہاد یاں

ہے مری وحشت عدوئے اعتباراتِ جہاں

م

ہیں زوالِ آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں

قطرہ ہائے خونِ بسمل زیبِ داماں ہیں اسدؔ
ہے تماشا کردنی گلچینیِ جلاد یاں

سرشکِ آشفتہ سر تھا قطرہ زن مژگاں سے جانے میں
ط
رہے یاں شوخیِ رفتار سے پا آستانے میں

ہجومِ مژدۂ دیدار و پروازِ تماشا ہا
گلِ اقبالِ خس ہے چشمِ بلبل آشیانے میں

ہوئی یہ بیخودی چشم و زباں کو تیرے جلوے سے
کہ طوطی قفلِ زنگ آلودہ ہے آئینہ خانے میں

ترے کوچے میں ہے مشاطۂ واماندگی قاصد
پرِ پرواز زلفِ یار ہے ہدہد کے شانے میں

کجا معزولیِ آئینہ کو ترکِ خود آرائی
نمد در آب ہے اے سادہ پرکار اس پیمانے میں

بحکمِ عجزِ ابروئے مہِ نو حیرت ایما ہے
کر یاں گم کر جبینِ سجدہ فرسا آستانے میں

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
م
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ
م
نہ کر بیباک اس کافر کو الفت آزمانے میں
نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

فریدوں کی دوستوں نے حرصِ قاتل ذوقِ کشتن میں
مى
ہوئے ہیں بخیہ ہائے زخم جوہر تیغِ دشمن میں

بوسہ نہیں۔ نہ دیجیے دشنام ہی سہی — آخر زباں تو رکھتے ہو تم۔ گر دہاں نہیں

ہر چند۔ جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے — ہر چند۔ پشتِ گرمیِ تاب و تواں نہیں

جاں مطربِ ترانۂ ھَل مِن مزید ہے — ق — لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم — دل میں چھری چبھو۔ مژہ گر خونچکاں نہیں

ہے ننگِ سینہ۔ دل گر آتش کدہ نہ ہو — ہے عارِ دل۔ نفس اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں۔ بلا سے ہو گھر خراب — سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

کہتے ہو "کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں"؟ — گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں — روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ۔ ولے کیوں کہے ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

ہے ترحّم آفریں آرایشِ بیداد یاں — قل — اشکِ چشمِ دام ہے ہر دانۂ صیاد یاں

ہے گدازِ موم اندازِ چکیدن ہائے خوں — نیشِ زنبورِ عسل ہے نشترِ فصّاد یاں

ناگوارا ہے ہمیں احسانِ صاحب دولتاں — ہے زرِ گل بھی نظر میں جوہرِ فولاد یاں

دل[1] لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا — م — بارے اپنے دردِ دل کی ہم نے پائی داد یاں

[1] یہ اور اس کے بعد کا شعر دونو قلمی نسخے کے حاشیے پر بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔

ریختہ کا وہ ظہوری ہے بقولِ ناسخ
غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ | م | آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں"

قلمی

جائیکہ پائے سیلِ بلا درمیاں نہیں | دیوانگاں کو واں ہوسِ خانماں نہیں
کس جرم سے ہے چشم تجھے حسرتِ قبول | برگِ حنا مگر مژۂ خوں فشاں نہیں
ہر رنگِ گردشِ آئینہ ایجادِ درد ہے | اشکِ سحاب جز بوداعِ خزاں نہیں
جز عجز کیا کروں بہ تمنائے بیخودی | طاقت حریفِ سختیِ خوابِ گراں نہیں
عبرت سے پوچھ دردِ پریشانیِ نگاہ | یہ گردِ وہم جز بسرِ امتحاں نہیں
گل غنچگی میں غرقۂ دریائے رنگ ہے | اے آگہی! فریبِ تماشا کہاں نہیں

برقِ بجانِ حوصلہ آتش فگن اسدؔ
اے دل فسردہ طاقتِ ضبطِ فغاں نہیں

مطبو

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں | اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں
کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا | پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز | نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

لہ یہ دونوں ہم طرح غزلیں میرزا غالب کی ابتدائی عشق اور انتہائی پختگی کے نمونے پیش کرتی ہیں پہلی غزل قلمی نسخے کی ہے اور دوسری غزل اور قطعہ مروجہ دیوان میں متداول ہے۔

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم	م	قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کر اے محوِ آئینہ داری	م	تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے		کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں	مل	ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں	م	جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں
حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے	م	جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں
رنجِ نومیدیِ جاوید۔ گوارا رہیو	م	خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں
سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے	م	لذتِ سنگ۔ بہ اندازۂ تقریر نہیں
آئینہ دام کو پردے میں چھپاتا ہے عبث		کہ پری زادِ نظر قابلِ تسخیر نہیں
مثلِ گل زخم ہے میرا بھی سناں سے توام		تیرا ترکش ہی کچھ آبستنیِ تیر نہیں
جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے	م	کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں
میر[1] کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب		جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

[1] یہ شعر مولانا حسرت اور مولانا نظامی کے شائع کردہ دیوان کے آخر میں درج ہے۔

ہم سے کھل جاؤ۔ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن م

قرض کی پیتے تھے مے۔ لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن م

غرۂ رفعت بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو م
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن م

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن م

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
کسو کو۔ زخود رستہ کم دیکھتے ہیں — کہ آہو کو پابندِ رم دیکھتے ہیں
خطِ لختِ دل یک قلم دیکھتے ہیں — مژہ کو جواہر رقم دیکھتے ہیں
دلِ آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے — م — سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

کب مجھ کوے یار میں۔ رہنے کی وضع یاد تھی؟
آئینہ دار بن گئی۔ حیرتِ نقشِ پا۔ کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال۔ وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں۔ مارے ہے دست و پا کہ یوں

تخی

آنسو کہوں۔ کہ آہ۔ سوارِ ہوا کہوں
ایسا عناں گسیختہ آیا کہ کیا کہوں

اقبالِ کلفتِ دلِ بے مدعا رسا
اختر کو داغ سایۂ بالِ ہما کہوں

مضمونِ وصل ہاتھ نہ آیا۔ مگر اسے
اب طائرِ پریدۂ رنگِ حنا کہوں

م

حلقے ہیں چشمہائے کشادہ بسوئے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

دزدیدنِ دلِ ستم آمادہ ہے محال
مژگاں کہوں کہ جوہرِ تیغِ قضا کہوں

طرز آفرینِ نکتہ سرائیِ طبع ہے
آئینۂ خیال کو طوطی نما کہوں

غالب ہے رتبہ فہمِ تصور سے کچھ پرے
ہے عجز بندگی جو علی کو خدا کہوں

مطو

مجھ سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا
گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو۔ اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے۔ مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے۔ خدا نہ کردہ۔ تجھے بے وفا کہوں!

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا۔ کہ بن کہے
اُس کے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں م

رات کے وقت مے پیے۔ ساتھ رقیب کو لیے
آے وہ یاں خدا کرے۔ پر نہ کرے خدا کہ یوں م

بزم میں اُس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھیے
اُس کی تو خاموشی میں بھی۔ ہے یہی مدعا کہ یوں م

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی"
سُن کے ستم ظریف نے مجھکو اُٹھا دیا۔ کہ یوں" م

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
{شعراستہ کے ایک وہ پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں} م

غیر سے رات کیا بنی"۔ یہ جو کہا۔ تو دیکھیے مطلع
سامنے آن بیٹھنا۔ اور یہ دیکھنا۔ کہ یوں

مجھ سے کہا جو یار نے۔ "جاتے ہیں ہوش کس طرح"
دیکھ کے میری بیخودی۔ چلنے لگی ہوا۔ کہ یوں

ولہ وہ فراق اور وہ وصال کہاں	م قلمی	وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں	
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے	م	ذوقِ نظارۂ جمال کہاں	
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا	م	شورِ سودائے خط و خال کہاں	
تھی وہ اک شخص کے تصور سے	م	اب وہ رعنائیِ خیال کہاں	
ایسا آساں نہیں لہو رونا	م	دل میں طاقت جگر میں حال کہاں	
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق	م	واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں	
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں	م	میں کہاں اور یہ وبال کہاں	
فلکِ سفلہ بے محابا ہے		اس ستمگر کو انفعال کہاں	
بوسہ میں وہ مضائقہ نہ کرے		پر مجھے طاقتِ سوال کہاں	

م

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

قلمی

ولہ غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

م

ل؎ یہ غزل قلمی نسخے کے حاشیے پر درج ہے۔ مطبوعہ دیوانوں میں اس کے مقطعے سے پہلے کے دو شعر نہیں ملتے
؎ قلمی نسخے کے متن میں اس غزل کے چھ شعر درج ہیں مروجہ غزل کے باقی چار شعر حاشیے پر بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔

ردیف
"ن"
(۱)

فی

خوش وحشتے کہ عرضِ جنونِ فنا کروں
جوں گردِ راہ۔ جامۂ ہستی قبا کروں

گر بعدِ مرگ وحشتِ دل کا گلہ کروں
موجِ غبار سے پرِ یک دشت وا کروں

آ اے بہارِ ناز! کہ تیرے خرام سے
دستار گردِ شاخِ گُلِ نقشِ پا کروں

خوش اُفتادگی۔ کہ بہ صحرائے انتظار
جوں جادہ گردِ رہ سے نگہ سرمہ سا کروں

صبر اور یہ ادا کہ دل آوے اسیرِ چاک
درد اور یہ کمیں کہ رہِ نالہ وا کروں

وہ بیدماغِ منتِ اقبال ہوں کہ میں
وحشت بہ داغِ سایۂ بالِ ہما کروں

وہ التماسِ لذتِ بیداد ہوں کہ میں
تیغِ ستم کو پشتِ خمِ التجا کروں

وہ رازِ نالہ ہوں کہ بشرحِ نگاہِ عجز
افشاں غبارِ سرمہ سے فردِ صدا کروں

ہوں[۱] وامِ بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش اسد
لیکن یہ بیم ہے کہ کہاں سے ادا کروں

مجوزہ

ہوں وامِ بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے
غالبؔ یہ بیم ہے کہ کہاں سے ادا کروں

[۱] مروجہ دیوانوں میں اس غزل کا صرف مقطع ملتا ہے اور اس میں بھی یہ فرق ہے کہ تخلص "اسد" کو بدل کر "غالب" کیا ہے

ڈرتا ہوں کوچہ گردیِ بازارِ عشق سے
ہیں خارِ راہ - جوہرِ تیغِ عسس تمام

اے بالِ اضطراب کہاں تک فسردگی
یک پر زدن تپش میں ہے کارِ قفس تمام

گذرا جو آشیاں کا تصور بوقتِ بند
مژگانِ چشمِ دام ہوئے خار و خس تمام

کرنے نہ پائے ضعف سے شورِ جنوں اسدؔ
اب کی بہار کا یونہی گزرا برس تمام

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور [لہ]
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعوئے وارستگی کی شرم

لہ قلمی دیوان میں اس طرح کے کوئی شعر نہیں ملتے۔

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال	م	ہیں ورق گردانیٔ نیرنگِ یک بتخانہ ہم
شوخی نے باندھا ہے پیمانِ گراں خوابی اسدؔ؎ ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو	م	ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

ازانجا کہ حسرت کشِ یار ہیں ہم	قمی	رقیبِ تمنائے دیدار ہیں ہم
رسیدن گلِ باغِ واماندگی ہے		عبث محفل آرائے رفتار ہیں ہم
نفس ہو نہ معزولِ شعلہ دُرُودن		کہ ضبطِ تپش سے شرر کار ہیں ہم
تغافل کمیں گاہِ وحشت شناسی		نگہبانِ دلہائے اغیار ہیں ہم
تماشائے گلشن تمنائے چیدن		بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم
نہ ذوقِ گریباں۔ نہ پروائے داماں		نگاہ آشنائے گل و خار ہیں ہم

اسدؔ! شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
ہجومِ تمنا سے لاچار ہیں ہم

جس دم کہ جادہ وار ہو تارِ نفس تمام	قمی	پیمائشِ زمینِ رہِ عمر بس تمام
کیا دے صدا۔ کہ الفتِ گمگشتگاں سے آہ		ہے سرمہ۔ گردِ رہ۔ بگلوئے جرس تمام

؎ مروجہ دیوانوں میں اس مصرع میں سے تخلص کو نکال کر بصورت مذکور بدل دیا ہے۔ اور دو غزلوں میں سے پانچ شعر انتخاب کرکے پہلی غزل کے مقطع کو آخر میں ڈال دیا ہے۔

مشقِ از خود رفتگی سے ہیں بہ گلزارِ خیال
آشنا تعبیرِ خوابِ سبزۂ بیگانہ ہم

فرطِ بے خوابی سے ہیں شبہائے ہجرِ یار میں
جوں زبانِ شمع داغِ گرمیِ افسانہ ہم

جانتے ہیں جوششِ سودائے زلفِ یار میں
سنبلِ بالیدہ کو موئے سرِ دیوانہ ہم

بسکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے
چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمعِ ماتم خانہ ہم

شامِ غم میں سوزِ عشقِ[1] آتشِ رخسار سے
پرفشانِ سوختن ہیں صورتِ پروانہ ہم

م

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

تمی

رہتے ہیں افسردگی سے سخت بیدردانہ ہم
شعلہ اندرِ سمندر بالکا آتش خانہ ہم

حسرتِ عرضِ تمنا یاں سے سمجھا چاہیے
دو جہاں حشرِ زبانِ خشک ہیں جوں شانہ ہم

کشتیِ عالم بہ طوفانِ تغافل دے کہ ہیں
عالمِ آب گدازِ جوہرِ افسانہ ہم

وحشتِ بے ربطیِ پیچ و خمِ ہستی نہ پوچھ
ننگِ بالیدن ہیں جوں موئے سرِ دیوانہ ہم

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پر موہوم ہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں

[1] پہلے یہی مقطع تھا اور یہ مصرع اس طرح تھا۔
"شامِ غم میں سوزِ عشقِ شمع رویاں سے اسدؔ"
پھر اسے بہ طرزِ بالا بدل دیا گیا اور دوسرا مقطع کہہ کر حاشیے پر درج کر دیا۔

ردیف

"م"

اثر کمندیِ فریادِ نارسا معلوم
غبارِ نالہ کمیں گاہِ مدعا معلوم

بقدرِ حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے
وگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا معلوم

بہ نالہ حاصلِ دلبستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

بہار در گرۂ غنچہ شہرِ جولاں ہے
طلسمِ ناز بجز تنگیِ قبا معلوم

طلسمِ خاک کمیں گاہِ یک جہاں سودا
بمرگ تکیۂ آسائشِ فنا معلوم

تکلف آئینۂ دو جہاں مدارا ہے
سراغِ یک نگہِ قہر آشنا معلوم

تعلی
م

اسد فریفتۂ انتخابِ طرزِ جفا
وگرنہ دلبریِ وعدۂ وفا معلوم

بسکہ ہیں بدمستِ بشکن بشکنِ میخانہ ہم
موئے شیشہ کو سمجھتے ہیں خطِ پیمانہ ہم

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

بسکہ ہر یک موئے زلف افشاں سے ہے تارِ شعاع
پنجۂ خورشید کو سمجھے ہیں دستِ شانہ ہم

ہے فروغِ ماہ سے ہر موج یک تصویرِ خاک[١]
سیل سے فرشِ کتاں کرتے ہیں تا ویرانہ ہم

تعلی
م

[١] یہ مصرع پہلے یوں تھا "نقش بندِ خاک ہے موج از فروغِ ماہتاب"۔ مگر اس پر "لا لا" لکھ کر حاشیے پر اسے اس طرح بدل دیا

خاک ہے عرضِ بہارِ صد نگارستاں اسدؔ
حسرتیں کرتی ہیں میری خاطرِ آزادِ گل

گرچہ ہے یک بیضۂ طاؤس آسا تنگِ دل
ہے چمن سرمایۂ بالیدنِ صد رنگِ دل

بیدلوں سے ہے تپش جوں خواہشِ آبِ سراب
ہے شرر موہوم۱؎ اگر رکھتا نہ ہووے سنگِ دل

رشتۂ فہمیدہ ممسک ہے بہ بندِ کوتہی
عقدہ ساں ہے کینہ زیرِ پرِ خیالِ تنگدل

ہوں زبا افتادۂ اندازِ یادِ حسنِ سبز
کسقدر ہے نشہ فرسائے خمارِ رنگِ دل

شوقِ بے پروا کے ہاتھوں مثلِ سازِ نادرست
کھینچتا ہے آج نالے خارجِ آہنگِ دل

اے اسدؔ خاموش ہو طوطیِ شکر گفتارِ طبع
ظاہرا رکھتا ہے آئینہ اسیرِ زنگِ دل

۱؎ متن میں "معلوم" تھا۔ حاشیے پر اسے "موہوم" بنایا ہے

بے نفس پروردۂ گلشن کس ہوائے بام کا
طوقِ قمری میں ہے سروِ باغ ریحانِ نہال

ہم غلط سمجھے تھے لیکن۔ زخمِ دل پر رحم کر
آخر اس پردے میں تو ہنستی تھی ای صبحِ وصال

بیکسی افسردہ ہوں اے ناتوانی کیا کروں
جلوۂ خورشید سے ہو گرم پہلوئے ہلال

شکوۂ دردو و درد داغ ای بیوفا معذور رکھ
خوں بہائے یک جہاں امید ہے تیرا خیال

عرضِ دردِ بیوفائی وحشتِ اندیشہ ہے
خوں ہوا دل تا جگر۔ یارب زبانِ شکوہ لال

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
مالِ سُنّی کو مباح اور خونِ صوفی کو حلال

بہرِ عرضِ حالِ شبنم ہے رقم ایجادِ گل
ظاہر ہے اس چمن میں لالِ مادر زادِ گل

گر کرے انجام کو آغاز ہی میں یادِ گل
غنچے سے منقارِ بلبل وار ہو فریادِ گل

گر بہ بزمِ باغ کھینچے نقشِ روئے یار کو
شمع ساں ہو جائے قطِّ خامۂ بہزادِ گل

دستِ رنگیں سے جو رخ پرواکرے زلفِ رسا
شاخِ گل میں ہو نہاں جوں شانہ در شمشادِ گل

سعیِ عاشق ہے فروغ افزای آبِ روئے کار
ہے شرارِ تیشہ۔ بہرِ تربتِ فرہادِ گل

ہے تصورِ صافیِ قطعِ نظر از غیرِ یار
تختِ دل سے لاوے ہے شمعِ خیال آبادِ گل

گلشن آبادِ دلِ مجروح میں ہو جائے ہے
غنچۂ پیکانِ شاخِ ناوکِ صیادِ گل

برق سامانِ نظر ہے جلوۂ بیباکِ حسن
شمعِ خلوت خانہ سمجھے ہے بادا بادِ گل

بدر ہے آئینۂ طاقِ ہلال	تملی	غافلاں! نقصاں سے پیدا ہے کمال
ہے بہ یادِ زلفِ مشکیں سال و ماہ		روزِ روشن شامِ آنسوئے خیال
بسکہ ہے اہلِ دمید نما غبار		ہے نہالِ شکوۂ ریحاں سفال
صافیِ رخسار سے ہنگامِ شب		عکسِ داغِ شب ہوا عارض پہ خال
نور سے تیرے ہے اُس کی روشنی		ورنہ ہے خورشید کیدستِ سوال
شورِ حشر اُس فتنہ قامت کے حضور		سایہ آسا ہو گیا ہے پائمال

ہو جو بلبل پیروِ فکرِ اسد
غنچۂ منقارِ گل ہو زیرِ بال

ہر عضو غم سے ہے شکن آسا شکستہ دل	تملی	جوں زلفِ یار ہوں میں سراپا شکستہ دل
ہے سرنوشت میں رقمِ واشکستگی		ہوں جوں خطِ شکستہ بہر جا شکستہ دل
امواج کی جو یہ شکنیں آشکار ہیں		ہے چشمِ اشک ریز سے دریا شکستہ دل
ناسازیِ نصیب و درشتیِ غم سے ہے		امید نا امید۔ و تمنا شکستہ دل

ہے سنگِ ظلمِ چرخ سے میخانہ میں اسد
صہبا فتادہ خاطر و مینا شکستہ دل

ہوں بہ وحشت انتظار آوارۂ دشتِ خیال	تملی	اک سفیدی مانگتی ہے دورۂ چشمِ غزال

ردیف

ل

م قلمی
ہے کسقدر ہلاکِ فریبِ وفاے گلُ!
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہاے گلُ

م
آزادیِ نسیم مبارک۔ کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہواے گلُ

م
جو تھا، سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے واے۔ نالۂ لبِ خونیں نواے گلُ

دیوانگاں کا چارہ فروغِ بہار ہے
ہے شاخِ گلُ میں پنجۂ خوباں بجاے گلُ

م
خوش حال اُس حریفِ سیہ مست کا۔ کہ جو
رکھتا ہو۔ مثلِ سایۂ گلُ سر بپاے گلُ

م
ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لیے بہار
میرا رقیب ہے۔ نفسِ عطر ساے گلُ

مژگاں تلک رسائیِ لختِ جگر کہاں
اے واے گر نگاہ نہ ہو آشناے گلُ

م
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
میناے بے شراب و دلِ بے ہواے گلُ

م
سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ اداے گلُ

م
تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گلُ در قفاے گلُ

م
غالب مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے۔ گلِ جیبِ قباے گلُ

له یہ غزل قلمی نسخے کے حاشیے پر بعد میں بڑھائی گئی ہے اور چوتھے اور ساتویں شعر کے سوا باقی تمام شعر مجموعۂ مروجۂ دیوان میں موجود ہیں

ردیف
"گ"

گر تجھکو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ	م قلمی	یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ
اے آرزو شہیدِ وفا خوں بہا نہ مانگ		جز بہرِ دست و بازوئے قاتل دعا نہ مانگ
گستاخیِ وصال ہے مشاطۂ نیاز		یعنی دعا بجز خمِ زلفِ دوتا نہ مانگ
برہم ہے بزمِ غنچہ بہ یک جنبشِ نشاط		کاشانہ بسکہ تنگ ہے غافل ہوا نہ مانگ
عیسیٰ طلسمِ حسن تغافل ہے۔ زینہار		جز پشتِ چشم نسخۂ عرضِ دوا نہ مانگ
میں دور گردِ عرضِ رسومِ نیاز ہوں		دشمن سمجھ۔ ولے نگہِ آشنا نہ مانگ
نظارہ دیگر و دلِ خونیں نفس دگر		آئینہ دیکھ۔ جوہرِ برگِ حنا نہ مانگ
		مجھ سے حسابِ بے گنہی اے خدا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد	م	مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

یک بختِ اوج نذرِ سبکباریِ اسدؔ
سر پر وبالِ سایۂ بالِ ہما نہ مانگ

رونے نے طاقت اتنی نہ چھوڑی کہ ایکبار
سیلِ بنائے ہستیِ شبنم ہے آفتاب

مژگاں کو دوں فشارِ پئے امتحانِ اشک
چھوڑے نہ چشم میں تپشِ دل نشانِ اشک

ہنگامِ انتظارِ قدومِ بتاں اسد
ہے بر سرِ مژہ نگراں دیدبانِ اشک

یہ دو شعر متن میں نہیں تھے۔ حاشیے پر بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔

یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ فرطِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک	م تجی	کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ	م	دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب۔ اور تمنا بیتاب	م	دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
تا قیامت شبِ فرقت میں گزر جائیگی عمر		سات دن ہم پہ بھی بھاری ہیں سحر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے۔ لیکن	م	خاک ہو جائیں گے ہم۔ تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم	م	میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل	م	گرمیِ بزم ہے۔ اک رقصِ شرر ہونے تک

م

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ۔ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک	قلی	لایا ہے لعلِ بیش بہا کاروانِ اشک
ظاہر کرے ہے جنبشِ مژگاں سے مدعا		طفلانہ۔ ہاتھ کا ہے اشارہ زبانِ اشک
میں وادیٔ طلب میں ہوا جملہ تن عرق		از بسکہ صرفِ قطرہ زنی تھا بیانِ اشک
دل خستگاں کو ہے طربِ صد چمن بہار		باغِ بخوں تپیدن و آبِ روانِ اشک

ردیف
ک

زخم پر باندھے ہیں کب طفلانِ بے پروا نمک	قلمی	کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک
زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک	م	
گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل	م	ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کسقدر پیدا نمک
یاد ہیں اے ہمنشیں۔ وہ دن کہ وجدِ ذوق میں		زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک
شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا؟ کہ آج	م	گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک
مجھکو ارزانی رہے۔ تجھکو مبارک ہو جیو	م	نالۂ بلبل کا درد۔ اور خندۂ گل کا نمک
داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی۔ واہ واہ	م	یاد کرتا ہے مجھے۔ دیکھے ہے وہ جس جا نمک
چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے	م	دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک
غیر کی منت[۱] نہ چھوڑونگا پئے توفیرِ درد		زخمِ دل جوں خندۂ خوباں ہے سرتاپا نمک
اس عمل میں عیش کی لذت نہیں ملتی اسدؔ		زور نسبت مے سے رکھتا ہے نصارا کا نمک
غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد	مطبوعہ	زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سرتاپا نمک

۱؎ یہ شعر قلمی نسخے کے متن میں نہیں تھا بعد میں حاشیے پر بڑھایا گیا ہے۔ اور پھر تھوڑی سی ترمیم کے بعد مروجہ دیوانوں میں شائع ہوا ہے۔

مفتِ ؔ دل و جگر خلشِ غمزہ ہائے ناز
ہر مو بدن پہ شہپرِ پرواز ہے مجھے

کاوش فروشیٔ مژۂ تیز یک طرف
بیتابیِ دلِ تپش انگیز یک طرف

یک جانب اے اسدؔ شبِ فرقت کا بیم ہے
دامِ ہوس ہے زلفِ دلاویز یک طرف

ؔ یہ شعر بھی حاشیے پر بعد میں بڑھایا گیا ہے ۱۲

ردیف

ف

حمی
نامہ بھی لکھتے ہو تو بخطِ غبار۔ حیف
رکھتے ہو مجھ سے اتنی کدورت ہزار حیف

م
ہم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

بیش از نفس بتاں کے کرم نے وفا نہ کی
تھا محملِ نگاہ بہ دوشِ شرار حیف

تھی میرے ہی جلانے کو اے آہ شعلہ ریز
گھر پر پڑا نہ غیر کے کوئی شرار حیف

سلہ گل چہرہ ہے کسی خفقانی مزاج کا
گھبرا رہی ہے بیمِ خزاں سے بہار حیف

م
سلہ جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

ہیں میری مشتِ خاک سے اسکو کدورتیں
پائی جگہ بھی دل میں۔ تو ہو کر غبار حیف

بنتا اسد میں سرمۂ چشمِ رکابِ یار
آیا نہ میری خاک پہ وہ شہسوار حیف

قلی
عیسیٰ مہرباں ہے شفا ریز یک طرف
دردِ آفریں ہے طبعِ الم خیز یک طرف

سنجیدگی ہے ایک طرف رنجِ کوہکن
خوابِ گرانِ خسروِ پرویز یک طرف

خرمن بباد دادہ دعوے ہیں۔ ہو سو ہو
ہم اک طرف ہیں برقِ شرر بیز یک طرف

سلہ یہ دونوں شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔ ان میں سے سلہ عام طور پر متداول ہے۔

جوش گل کرتا ہے استقبال تحریر اسد

زیر مشق شعر ہے نقش از پے احضار باغ

DRAWN BY SA.H. JARI

ردیف
"غ"

عشاق اشکِ چشم سے دھوویں ہزار داغ
دیتا ہے اور جوں گل و شبنم بہار داغ

جوں چشمِ باز ماندہ ہے ہر یک بسوئے دل
رکھتا ہے داغ تازہ کا یاں انتظار داغ

ہے لالہ عارضاں مجھے گلگشتِ باغ میں
دیتی ہے۔ گرمیٔ گل و بلبل۔ ہزار داغ

جوں اعتماد نامہ و خط کا۔ ہو مُہر سے
یوں عاشقوں میں ہے سببِ اعتبار داغ

ہوتے ہیں نیست جلوۂ خورسے ستارگاں
دیکھ اُس کو دل سے مٹ گئے بے اختیار داغ

وقتِ خیالِ جلوۂ حسنِ بتاں اسدؔ
دکھلائے ہے مجھے دو جہاں لالہ زار داغ

بلبلوں کو دور سے کرتا ہے منع بارِ باغ
ہے زبانِ پاسبانِ خارِ سرِ دیوارِ باغ

کون آیا جو چمن بیتابِ استقبال ہے
جنبشِ موجِ صبا ہے شوخیٔ رفتارِ باغ

ہیں ہمہ حیرت جنوں بیتاب ودرانِ خمار
مردمِ چشمِ تماشا نقطۂ پرکارِ باغ

آتشِ رنگِ رخِ ہر گل کو بخشے ہے فروغ
ہے دمِ سردِ صبا سے گرمیٔ بازارِ باغ

کون گل سے ضعفِ خاموشیٔ بلبل کہہ سکے
نے زبانِ غنچہ گویا۔ نے زبانِ خارِ باغ

ے اس ردیف کا کوئی شعر مروجہ دیوان میں نظر سے نہیں گزرا۔

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے م بجلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ م شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیِ شمع

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو

اسد ہے دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

ردیف
"ع"

جادۂ رہ۔ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع	قلمی	چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع
شمع سے ہے بزم انگشتِ تحیر در دہن		شعلۂ آوازِ خوباں پر بہ ہنگامِ سماع
جوں پرِ طاؤس جوہر تختہ مشقِ رنگ ہے		بسکہ ہے وہ قبلۂ آئینہ محوِ اختراع
رنجشِ حیرت سرشتاں سینہ صافی پیشکش		جوہرِ آئینہ ہے یاں گردِ میدانِ نزاع
چار سوئے دہر میں بازارِ غفلت گرم ہے		عقل کے نقصاں سے اٹھتا ہے خیالِ انتفاع

آشنا۔ غالب نہیں ہیں دردِ دل کے آشنا
ورنہ کس کو میرے افسانے کی تاب استماع

[1] رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع	قلمی	ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیٔ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ۔ خاموشی	م	یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع
کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام	م	بطرزِ اہلِ فنا ہے۔ فسانہ خوانیٔ شمع
غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ	م	ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع

[1] یہ غزل قلمی نسخے اور مطبوعہ دیوانوں میں بالکل مشترک ہے صرف مقطع میں کچھ خفیف سا فرق ہے
جو ناظرین کے پیش نظر ہے۔

اگر مضمونِ خاکستر کرے دیباچہ آرائی
کرے ہے لطفِ اندازِ برہنہ گوئیِ خوباں
دیا داغِ جگر کو آہ نے رنگِ شگفتن کا

نہ باندھے شعلۂ جوالہ غیر از گرد بادِ آتش
بہ تقریبِ نگارِ شہپائے سطرِ شعلہ یادِ آتش
نہ ہو بالیدہ غیر از جنبشِ دامانِ بادِ آتش

اسد قدرت سے حیدر کے ہوئی ہے بہر وقرصا کو
شرارِ سنگِ بت ہی بر بنائے اعتقاد آتش

ردیف
ش

لہ ہوئی ہے بسکہ صرفِ مشقِ تمکیں بہارِ آتش
بہ اندازِ حنا ہے رونقِ دستِ چنارِ آتش

قی

دیوے گر خس جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگاوے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

م

فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق
لہ نہ نکلے شمع کے پاسے نکالے گر نہ خار آتش

شرر ہے رنگ بعد اظہارِ تابِ جلوۂ تمکیں
کرے ہے سنگ پر خورشید آبِ آئینے کار آتش

بناوے ہے گدازِ موم ربطِ پیکر آرائی
نکالے کیا نہالِ شمع بے تخمِ شرار آتش

خیالِ دود تھا سر جوشِ سودائے غلط فہمی
اگر رکھتی نہ خاکستر نشینی کا غبار آتش

ہوائے پرفشانی برقِ خرمنہائے خاطر ہے
ببالِ شعلۂ بیتاب ہے پروانہ زار آتش

نہیں برق و شرر جز وحشت و ضبطِ تپیدنہا
بلاگردانِ بے پروا خرامیہائے یار آتش

دھوئیں سے آگ کے اک ابرِ دریا بار ہو پیدا
اسد حیدر پرستوں سے اگر ہووے دوچار آتش

بہ اقلیمِ سخن ہے جلوۂ گردِ سوادِ آتش
کہ ہے دودِ چراغاں سے ہیولائے مدادِ آتش

لہ پہلے یہ مصرع یوں تھا:- "ز جوشِ اعتدالِ فصل و تمکینِ بہارِ آتش"
لہ پہلے یہ مصرع اس طرح تھا:- "نکالے ہے ز پائے شمع برجا ماندہ خارِ آتش" پھر حاشیے پر اس کو یوں بدلدیا اور اب مروجہ دیوانوں میں یہ اسی طرح درج ہے۔

دریافتنِ صحبتِ اغیار۔ غرض ہے
اے نامہ رساں نامہ رساں چاہیے جا ہوں

ہے شوق اسد دستگہِ وصل کی منظور
ہوں خاک نشیں از پے ادراکِ قدم بوس

تیز تر ہوتا ہے خشمِ تند خویاں عجز سے
ہے رگِ سنگِ فساں تیغِ شعلہ خار و خس

سختیِ راہِ محبت منعِ دخلِ غیر ہے
پیچ و تابِ جادہ ہے یاں جوہرِ تیغِ عسس

اے اسدؔ خود ہم اسیرِ رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہرا صیادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس

دشتِ الفت میں ہے خاکِ کشتگاں محبوس بس
پیچ و تابِ جادہ ہے خطِ کفِ افسوس و بس

نیم رنگی ہائے شمعِ محفلِ خوباں سے ہے
پیچکِ مہ صرفِ چاکِ پردۂ فانوس و بس

ہے تصور میں نہاں سرمایۂ صد گلستاں
کاسۂ زانو ہے مجھ کو بیضۂ طاؤس و بس

کفر ہے غیر از وفورِ[۱] شوق رہبر خواستن
راہِ صحرائے حرم میں ہے جرس ناقوس و بس

یک[۲] جہاں گل تختۂ مشقِ شگفتن ہے اسدؔ
غنچۂ خاطر رہا افسردگی مانوس و بس

کرتا ہے بہ یادِ بتِ رنگیں دلِ مایوس
رنگِ ز نظر رفتہ حنائے کفِ افسوس

تھا خواب میں کیا جلوہ نظر جوشِ زلیخا
ہے بالشِ دل سوختگاں میں پرِ طاؤس

حیرت سے رخِ دوست کے ازبسکہ ہیں بیکار
خور قطرۂ شبنم میں ہے جوں شمع بہ فانوس

---

۱ پہلے "وفور" کی جگہ "گداز" تھا۔
۲ یہ مصرع پہلے یوں تھا۔
"اے اسدؔ گل تختۂ مشقِ شگفتن ہو گئے"

ردیف

"س"

قلمی
کب فقیروں کو رسائی بتِ مے خوار کے پاس
تونبے بو دیجیے میخانے کی دیوار کے پاس

م
مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی۔ قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

م
جگرِ تشنۂ آزار۔ تسلی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس

م
مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے۔ ہے
خوب وقت آئے تم۔ اس عاشقِ بیمار کے پاس

م
میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

م
دہنِ شیر میں جا بیٹھیے۔ لیکن اے دل!
نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس

م
دیکھ کر تجھکو چمن۔ بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود۔ پہنچے ہے گُل۔ گوشۂ دستار کے پاس

م
مر گیا پھوڑ کے سر۔ غالب وحشی ہے۔ ہے
بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

(۲)
حاصل وابستگی ہے عمرِ کوتاہ اور بس
وقت عرضِ عقدہ ہائے متصل تارِ نفس

کیوں نہ طوطیِ طبیعت نغمہ پیرائی کرے
باندھتا ہے رنگِ گل آئینہ بر چاکِ قفس

اے اوانجاں! صدا ہے تنگیِ فرصت سے خوں
ہے بصحرائے تحیر چشمِ قربانی جرس

لہ یہ غزل جو مرتبہ [illegible] میں چھپی ہوئی ہے قلمی دیوان کے حاشیے پر بعد میں لکھی گئی ہے اور اس میں مطلع بھی [illegible]

نہ بندھا تھا بہ عدم نقشِ دلِ مور ہنوز
تب سے ہے یاں دہنِ یار کا مذکور ہنوز

سبزہ ہے نوکِ زبانِ دہنِ گور ہنوز
حسرتِ عرضِ تمنا میں ہوں رنجور ہنوز

صد تجلی کدہ ہے صرفِ جبینِ غربت
پیرہن میں ہے غبارِ شررِ طور ہنوز

زخمِ دل میں ہے نہاں غنچۂ پیکانِ نگار
جلوۂ باغ ہے در پردۂ ناسور ہنوز

پا۔ پُراز آبلہ۔ راہِ طلبِ مے میں ہوا
ہاتھ آیا نہیں یک دانۂ انگور ہنوز

گل کھلے۔ غنچے چٹکنے لگے۔ اور صبح ہوئی
سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

اے اسد۔ تیرگیِ بخت سیہ ظاہر ہے
نظر آتی نہیں صبحِ شبِ دیجور ہنوز

٢

کیونکر اُس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

دل سے نکلا۔ پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

تاب لاتے ہی بنے گی **غالب**
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

لہ مروجہ دیوانوں میں اس ردیف کے فقط یہی تین شعر ایسے ہیں جنکی ہم طرح غزل بھی نسخے میں موجود نہیں ہے

چاکِ گریباں کو ہے ربطِ تامل ہنوز
غنچہ میں دل تنگ ہے حوصلۂ گل ہنوز

دل میں ہے سودائے زلف بستِ تغافل ہنوز
ہے مژۂ خوابناک ریشۂ سنبل ہنوز

پرورشِ نالہ ہے وحشتِ پروانہ سے
ہے تہِ بالِ پری بیضۂ بلبل ہنوز

عشقِ کمینگاہِ درد۔ وحشتِ دل دورگرد
دامِ تہِ سبزہ ہے حلقۂ کاکل ہنوز

لذتِ تقریرِ عشق۔ پردگیٔ گوشِ دل
جوہرِ افسانہ ہے عرضِ تحمل ہنوز

آئینۂ امتحاں نذرِ تغافل اسد
شش جہت اسباب ہے وہمِ توکل ہنوز

کو بیابانِ تمنا و کجا جولانِ عجز
آبلے پا کے ہیں یاں رفتار کو دندانِ عجز

ہو قبولِ کم نگاہی۔ تحفۂ اہلِ نیاز
اے دل وای جانِ ناز۔ ای دین وای ایمانِ عجز

بوسۂ پا انتخابِ بدگمانیہائے حسن
یاں ہجومِ عجز سے تا سجدہ ہے جولانِ عجز

حسن کو غنچوں سے ہے پوشیدہ چشمکہائے ناز
عشق نے وا کی ہر یک خار سے مژگانِ عجز

اضطرابِ نارسائی مایۂ شرمندگی
ہے عرق ریزیِ خجلت جوششِ طوفانِ عجز

وہ جہاں مسندنشینِ بارگاہِ ناز ہو
قامتِ خوباں ہو محرابِ نیازستانِ عجز

بسکہ بے پایاں ہے صحرائے محبت اے اسد
گرد بادِ اس راہ کا ہے عقدۂ پیمانِ عجز

داغِ اطفال ہے دیوانہ بہ کہسار ہنوز
خلوتِ سنگ میں ہے نالہ طلبگار ہنوز

قی

خانہ ہے سیل سے خو کردۂ دیدار ہنوز
دوربیں درزدہ ہے رخنۂ دیوار ہنوز

م

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک
گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز

م

یکقلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

آئی یک عمر سے معذورِ تماشا نرگس
چشمِ شبنم میں نہ ٹوٹا مژۂ خار ہنوز

کیوں ہوا تھا طرفِ آبلۂ پا یارب!
جادہ ہے واشدنِ پیچشِ طومار ہنوز

ہوں خموشیِ چمنِ حسرتِ دیدار اسدؔ
مژہ ہے شانہ کشِ طرۂ گفتار ہنوز

(۲)

حسنِ[ـه] خود آرا کو ہے مشقِ تغافل ہنوز
ہے کفِ مشاطہ میں آئینۂ گل ہنوز

سادگیِ یک خیال۔ شوخیِ صد رنگِ نقش
حیرتِ آئینہ ہے جیبِ تامل ہنوز

سادہ و پرکار تر۔ غافل و ہشیار تر
مانگے ہے شمشاد سے شانۂ سنبل ہنوز

ساقی و تعلیمِ رنج۔ محفل و تمکیں گراں
سیلیِ استاد ہے ساغرِ بے مُل ہنوز

شغلِ ہوس در نظر۔ لیک حیا بے خبر
شاخِ گل نغمہ ہے نالۂ بلبل ہنوز

دل کی صدائے شکست سازِ طرب ہے اسدؔ
شیشۂ بے بادہ سے چاہے ہے قلقل ہنوز

ـه یہ دو غزلیں ہیں جن کا ہمطرح کوئی شعر مطبوعہ دیوانوں میں نہیں پایا جاتا۔

نہ گلِ نغمہ ہوں۔ نہ پردۂ ساز	م	میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو۔ اور آرائشِ خمِ کاکل	م	میں۔ اور اندیشہاے دور و دراز
لافِ تمکیں۔ فریبِ سادہ دلی	م	ہم ہیں اور رازہاے سینہ گداز
ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیاد	م	ورنہ باقی ہو طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے		ناز کھینچوں۔ بجاے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں		جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز
اے ترا غمزہ۔ یک قلم انگیز اے ترا جلوہ یک قلم انگیز	م	اے ترا ظلم سر بسر انداز
تو ہوا جلوہ گر۔ مبارک ہو	م	ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز
نگہِ التفات سوے اسدؔ[ل] مجھکو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا	م	میں غریب اور تو غریب نواز

مقطع	اسد اللہ خاں تمام ہوا اے دریغا۔ وہ رندِ شاہد باز	

ل متن میں پہلے یہ مصرع یوں تھا: "یا علی ایک نگاہ سوے اسدؔ" پھر اسے اس صورت میں بدلا لیکن بدستور مقطع رہنے دیا۔ پھر اس کے بعد غالباً سہ بارہ نظر کرتے وقت اس میں سے تخلص بھی نکال ڈالا اور شعر کی صورت ہی بدل دی اور ایک نیا مقطع بڑھا دیا جو عام طور پر مشہور ہے۔

میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں	م	خمیازہ کھینچے ہے بتِ بیدادفن ہنوز
گو یک شرر ہے کہ سازِ چراغاں کریں ہم		بزمِ طرب ہے پردگیِ سوختن ہنوز
حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز	حمی[1]	دعا قبول ہو۔ یارب! کہ عمرِ خضر دراز
نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود	م	ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز
فریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ		نگاہ عکس فروش و خیال آئینہ ساز
وصال جلوہ تماشا ہے۔ پر دماغ کہاں	م	کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز
ہنوز اے اثرِ دیدِ ننگِ رسوائی		نگاہ فتنۂ خرام و درِ دو عالم باز
زبس[2] کہ جلوۂ صیاد حیرت آرا ہے		اڑی ہے صفحۂ خاطر سے صورتِ پرواز
ہجومِ[3] فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے		کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز
اسد[4] سے ترکِ وفا کا گماں وہ معنی ہے		کہ کھینچیے پرِ طائر سے صورتِ پرواز
ہر[5] ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست	مطبوعہ	گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ[6] وسعتِ میخانۂ جنوں غالبؔ
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے۔ ایک خاک انداز

[1] حمی نسخے کے حاشیے پر یہ چاروں شعر درج ہیں جن میں سے آخری دو عام طور پر مطبوعہ دیوان میں پائے جاتے ہیں۔
[2] متن میں مقطع پر لا لا۔ لیکن اس کی جگہ وہ مقطع بڑھایا ہے جو مطبوعہ دیوانوں میں ملتا ہے۔
[3] نہ پوچھ وسعت۔ الخ

ردیف "ز"

بیگانۂ وفا ہے ہوائے چمن ہنوز	قلمی	وہ سبزہ سنگ پر نہ اُگا کوہکن ہنوز
یارب! یہ دردمند ہے کس کی نگاہ کا		ہے ربطِ مشک و داغِ سوادِ ختن ہنوز
جوں جادہ سر بکوئے تمنائے بیدلی		زنجیرِ پا ہے رشتۂ حبّ الوطن ہنوز
ہے نازِ مفلساں زرِ ازدست رفتہ پر	م	ہوں گلفروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز
میں دُور گردِ قربِ بساطِ نگاہ تھا		بیرونِ دل نہ تھی تپشِ انجمن ہنوز

تھا مجھکو خار خارِ جنونِ وفا اسدؔ

سوزن میں تھا نہفتہ گُلِ پیرہن ہنوز

میں ہوں سرابِ یک تپش آموختن ہنوز	قلمی	زخمِ جگر ہے تشنۂ لب دوختن ہنوز
اے شعلہ! فرصتے کہ سویدائے دل سے ہوں		کشتِ سپندِ صد جگر اندوختن ہنوز
فانوسِ شمع ہے کفنِ کشتگانِ شوق		درپردہ ہے معاملۂ سوختن ہنوز
مجنوں! فسونِ شعلہ خرامی فسانہ ہے		ہے شمع جادہ داغِ نیفروختن ہنوز
فارغ[لہ] مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر	م	ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

لہ یہ دونوں متداول شعر بھی قلمی نسخے کے حاشیہ پر موجود ہیں لکھ دیے گئے ہیں۔ دوسرا شعر صفحہ [illegible] کے شروع میں تحریر ہے۔

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ۔ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش؟
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو۔ جو کہتے ہو۔ کہ کیوں جیتے ہیں غالبؒ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

ابرو سے ہے کیا اُس نگہِ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر مگر اُس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو۔ تو ہمیں کیا غم؟ جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے۔ جا کر دل و جاں اور

ہر چند سبکدست ہوئے۔ بت شکنی میں
ہم ہیں۔ تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

ہے خونِ جگر جوش میں۔ دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

لیتا۔ نہ اگر دل تمھیں دیتا۔ کوئی دم چین
کرتا۔ جو نہ مرتا۔ کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ۔ تو رُک جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ **غالب** کا ہے اندازِ بیاں اور"

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائیگا سر۔ گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل۔ اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"
مانا۔ کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو "قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور؟

ہاں۔ اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا۔ جو نہ مرتا کوئی دن اور

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھکر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھکر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہائے شرربار دیکھکر

کیا آبروئے عشق؟ جہاں عام ہو جفا
رُکتا ہوں۔ تم کو۔ بے سبب آزار دیکھکر

آتا ہے میرے قتل کو۔ پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اُسکے ہاتھ میں تلوار دیکھکر

ثابت ہوا ہے۔ گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھکر

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھکر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کیساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھکر

زنار باندھ۔ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھکر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھکر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی۔ نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

سر پھوڑنا وہ **غالب** شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے۔ تری دیوار دیکھکر

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گذرتا ہے گماں اور

یارب۔ وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُنکو جو نہ دے مجھکو زباں اور

سعیِ خرام کاوشِ ایجادِ جلوہ ہے
جوشِ چکیدنِ عرق آئینہ کار تر

ہر گرد باد حلقۂ فتراکِ بیخودی
مجنونِ دشتِ عشق تحیّر شکار تر

اے چرخ! خاک بر سرِ تعمیرِ کائنات
لیکن بنائے عہدِ وفا اُستوار تر

آئینہ داغِ حیرت و حیرت شکنجِ یاس
سیماب بیقرار و اسدؔ بیقرار تر

(۳) ط گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر؟ کہے بغیر

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر۔ کہے بغیر

کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جسکا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے۔ وگرنہ ہم
سر جائے۔ یا رہے۔ نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑونگا میں نہ اُس بُتِ کافر کو پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ۔ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے۔ دشنۂ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے، بادۂ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں۔ تو چاہیے۔ دونا ہو التفات
سُنتا نہیں ہوں بات۔ مکرر کہے بغیر

غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

ط یہ وہ غزلیں ہیں جنکا ہم طرح کوئی شعر قلمی نسخے میں نہیں ہے۔

زندگانی پہ اعتماد غلط
ہے کہاں قیصر اور کہاں فغفور

کیجے جوں اشک اور قطرہ زنی
اے اسدؔ ہے ہنوز دلی دور

بسکہ دل ہے وہ رشکِ مہتاب آئینہ پر
ہے نفس تارِ شعاعِ آفتاب آئینہ پر

بازگشتِ جادہ پیمائے رہِ حیرت کہاں
غافلاں غش جا نکر چھڑکے ہیں آب آئینہ پر

بدگماں کرتی ہے عاشق کو خود آرائی تری
بیدلوں کو ہے براتِ اضطراب آئینہ پر

نازِ خود بینی کے باعث خونیِ صد بےگناہ
جوہرِ شمشیر کو ہے پیچ و تاب آئینہ پر

مدعی میرے صفائے دل سے ہوتا ہے خجل [له]
ہے تماشا زشتِ دیوں کا عتاب آئینہ پر

سدِ اسکندر ہوا زبہرِ نگاہِ گلرخاں
گر کرے یوں امر نہی بوتراب آئینہ پر

دل کو توڑا جوشِ بیتابی سے غالبؔ کیا کیا؟
رکھ دیا پہلو بوقتِ اضطراب آئینہ پر

بینش بسعیِ ضبطِ جنوں نوبہار تر
دل در گداز نالہ بہ کاہ آبیار تر

قاتل بعزمِ ناز و دل از زخم در گداز
شمشیر آبدار و نگاہ آبدار تر

بے کسوتِ عروجِ تغافل کمالِ حسن
چشمِ سیہ بہ برگِ نگہ سوگوار تر

له یہ شعر حاشیے پر بعد میں غالباً بخطِ غالبؔ بڑھایا گیا ہے۔

م
برنگِ کاغذِ آتش زدہ۔ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینۂ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

م
میں اور وہ بے سبب رنج آشنا۔ دشمن کہ رکھتا ہی
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

یہ کیا وحشت ہی؟ اے دیوانہ پیش از مرگ واویلا
رکھی بیجا بنائے خانۂ زنجیر شیون پر

م
اسد بسمل ہے کس انداز کا؟ قاتل سے کہتا ہے
"کہ مشقِ ناز کر۔ خونِ تمنا میری گردن پر"
"کہ مشقِ ناز کر۔ خونِ دو عالم میری گردن پر"

سیدم
جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گریباں ! چاک کا حق ہو گیا ہی میری گردن پر

فلک سے ہمکو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہی موقوف گلخن پر

بیا[1]

(۲)
شیشۂ آتشیں رخِ پرنور
عرق از خط چکیدہ۔ روغنِ مور

بسکہ ہوں بعدِ مرگ بھی نگراں
مردمک ہے خالِ برلبِ گور

بار لاتی ہے دانہائے سرشک
مژہ سے ریشۂ رزِ انگور

ظلم کرنا گدائے عاشق پر
نہیں شاہانِ حسن کا دستور

دوستو مجھ ستم رسیدہ سے
دشمنی ہے وصال کا مذکور

[1] یہ قلمی دیوان کی دو غزلیں ہیں جنکا کوئی شعر متداول نہیں ہے۔

لیا آئینہ نے حرزِ پرِ طوطی بچنگ آخر		خطِ نوخیز نیلِ چشم زخمِ صافیِ عارض
ہوا مہ کثرتِ سرمایہ اندوزی سے تنگ آخر		ہلال آسا تہی رہ۔ گر کشادہ نہائے دل چاہے
ہوا ناسورِ چشمِ تعزیت چشمِ خدنگ آخر		تڑپکر مر گیا وہ صیدِ بال افشاں۔ کہ مضطر تھا
ہوئی قطرہ فشانیہائے مے باران سنگ آخر		لکھی یاروں کی بدمستی نے میخانے کی پامالی
نہیں ہے نغمے سے خالی خمیدنہائے چنگ آخر		اسدؔ پردے میں بھی آہنگِ شوقِ یار قائم ہے

مطبوعہ

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

ہوا سکتے سے میں۔ آئینۂ دستِ طبیب آخر	قلمی	دیا یاروں نے بیہوشی میں درماں کا فریب آخر
تکلف برطرف۔ ملجائیگا تجھسا رقیب آخر	م	تمکش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھپہ عاشق ہیں
ملینگے منزلِ الفت میں ہم اے عندلیب آخر		رگِ گل جادۂ تارِ نگہ سے صد موافق ہے
نیازِ بال افشانی ہوا صبر و شکیب آخر		غرورِ ضبط۔ وقتِ نزع۔ ٹوٹا بیقرارانہ

اسدؔ کی طرح میری بھی بغیر از صبحِ رخساراں
ہوئی شامِ جوانی اے دلِ حسرت نصیب آخر

کہ وجدِ برق جوں پروانہ بال افشاں ہے خرمن پر	قلمی	فسونِ یکدلی ہے لذتِ بیدادِ دشمن پر
کہ رشتہ باندھتا ہے پیرہن انگشتِ سوزن پر		تکلف خار خارِ التماسِ بیقراری ہے

م	نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانہ میں حریف رازِ محبت مگر در و دیوار	
نہیں بندِ زلیخا بے تکلف ماہِ کنعاں پر نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی	قلمی م	سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہی زنداں پر
رلاتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر	م	میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر
دلِ خونیں جگر بے صبر و فیضِ عشق مستغنی	م	الٰہی یک قیامت خاور آ ٹوٹے بدخشاں پر
فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانہ سی	م	کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سی	م	بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر
نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا	م	کہ پشتِ چشم سے جس کی نہ ہووے مہر عنواں پر
مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا	م	کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر
بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا	م	قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر
اسد اے بے تحمل عربدہ بیجا ہے ناصح سے		کہ آخر بیکسوں کا زور چلتا ہی گریباں پر
مطبوعہ	نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر	
صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر	قلمی	تغیرِ آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

ردیف

"ر"

(۱)

بلاے ہیں جو پیشِ نظر درودیوار	قلمی	
بلاے ہیں جو یہ پیشِ نظر درودیوار	م	نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر درودیوار
جنونِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ		
وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ	م	کہ ہو گئے مرے دیوار و در درودیوار
نہیں ہے سایہ کہ سُنکر نویدِ مقدمِ یار	م	گئے ہیں چند قدم پیشتر درودیوار
کیا ہے تو نے جلوہ کس قدر ارزاں	م	
ہوئی ہے کس قدر ارزانیٔ مئے جلوہ	م	کہ مست ہے ترے کوچہ میں ہر درودیوار
جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار۔ تو۔ آ	م	کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر درودیوار
ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے	م	کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر درودیوار
وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے	م	ہوئے فدا درودیوار پر درودیوار
نہ پوچھ بیخودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب	م	کہ ناچتے ہیں پڑے سربسر درودیوار
نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی		ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھکر درودیوار

نوازشِ نفسِ آشنا کہاں۔ ورنہ
برنگِ نے ہے نہاں۔ در رہِ استخواں فریاد

تغافل آئینہ دارِ خموشیِ دل ہے
ہوئی ہے محو۔ بہ تقریبِ امتحاں فریاد

ہلاکِ بے خبری۔ نغمۂ وجود و عدم
جہان و اہلِ جہاں سے جہاں جہاں فریاد

جوابِ سنگدلیہائے دشمناں۔ ہمت
زدستِ[1] شیشۂ دلہائے دوستاں فریاد

ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسدؔ
خدا کے واسطے اے شاہِ بیکساں فریاد

[1] متن میں یہ مصرع پہلے یوں لکھا تھا:- "زدستِ شیشگیِ طبعِ دوستاں فریاد"

ہے دلبری کمینگر ایجادِ یک نگاہ ۔۔۔ کارِ بہانہ جوئی چشمِ حیا بلند

بالیدگی نیازِ قدِ جانفزا اسد
در ہر نفس۔ بقدرِ نفس۔ ہے قبا بلند

حسرتِ دستگہ و پائے تحمل تاچند ۔۔۔ رگِ گردن خطِ پیمانۂ بے مُل تاچند
ہے گلیمِ سیہ بختِ پریشاں کاکل ۔۔۔ موئینہ بافتنِ ریشۂ سنبل تاچند
کوکبِ بخت بجز روزنِ پُر دود نہیں ۔۔۔ عینکِ چشمِ جنوں حلقۂ کاکل تاچند
چشم بے خونِ دل و دل تہی از جوشِ نگاہ ۔۔۔ بزبانِ عرضِ فسونِ ہوسِ گُل تاچند
بزمِ داغِ طرب و باغِ کشادِ پرِ رنگ ۔۔۔ شمع و گل تا کے و پروانہ و بلبل تاچند
نالہ دامِ ہوس و درد اسیری معلوم ۔۔۔ شرح بر خود غلطیہائے تحمل تاچند
جوہرِ آئینہ۔ فکرِ سخن موئے دماغ ۔۔۔ عرضِ حسرت پسِ زانوئے تامل تاچند
سادگی ہے عدمِ قدرتِ ایجادِ غنا ۔۔۔ ناکسی! آئینۂ نازِ توکل تاچند

اسدِ خستہ گرفتارِ دو عالم اوہام
مشکل آساں کن یک خلق! تغافل تاچند

بہ کامِ دل کریں کس طرح گمرہاں فریاد ۔۔۔ ہوئی ہے لغزشِ پا لکنتِ زباں فریاد
کمالِ بندگی گل ہے رہنِ آزادی ۔۔۔ ز دستِ مشتِ پر و خارِ آشیاں فریاد

م

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد

قلمی

بسکہ وہ پاکوبیاں، در پردۂ وحشت ہیں یاد — ہے خلافِ دفچۂ خورشید۔ ہر یک گردباد
طرفہ موزونی ہے صرفِ جنگجوئی ہائے یار — ہے سرِ مصراعِ صافِ تیغ۔ خنجر مستزاد
ہاتھ آیا زخمِ تیغِ یار سا پہلو نشیں — کیوں نہ ہو سے آج کے دن بیکسی کی روح شاد
کیجے آہوئے ختن کو خضرِ صحرائے طلب — شک ہے سنبلستانِ زلف میں گردِ سواد
ہمنے سوزِ زخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی — گل ہوا ہی ایک زخمِ سینہ پر خواہانِ داد
بسکہ ہیں یاں در پردہ مصروفِ سیہ کاری تمام — آستر ہے۔ خرقۂ زاہد کا۔ صوفِ مداد

تیغ در کف کف بلب آتا ہو قاتل اس طرف
مژدہ باد اے آرزوئے مرگِ غالب مژدہ باد

قلمی

تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند — اے طفلِ خود معاملہ۔ قد سے عصا بلند
ویرانیے جز آمد و رفتِ نفس نہیں — ہے کوچہ ہائے نے میں غبارِ صدا بلند
رکھتا ہے انتظارِ تماشائے حسنِ دوست — مژگانِ باز ماندہ سے دستِ دعا بلند
موقوف کیجیے یہ تکلف نگاریاں — ہوتا ہے۔ ورنہ۔ شعلۂ رنگِ حنا بلند
قربانِ اوجِ ریزیِ چشمِ حیا پرست — یک آسمان ہے مرتبۂ پشتِ پا بلند

ردیف

"د"

حسن[١] غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد	م قمی	بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا	م	ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے	م	شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی	م	اُنکے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا	م	نگہِ ناز ہے سُرمے سے خفا میرے بعد
ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع	م	چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق	م	ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دُنیا میں کوئی	م	کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد
تھی[٢] نگہ میری نہانخانۂ دل کی نقاب		بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد
تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ		متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

[١] ردیف دال میں مروجہ دیوان میں فقط یہی ایک غزل ہے' اور اس کے بھی مقطع سے قبل کے دو شعر نہیں ملتے۔ باقی کی چاروں غزلیں قلمی نسخے کی ہیں۔

[٢] غالب نے اس شعر کو گویا بجنسہٖ اُٹھا کر اپنے ایک فارسی قصیدے میں رکھ لیا ہے۔ کہتا ہے :-

نگہم نقب ہمی زد بہ نہانخانۂ دل،
ذرہ اوا لیکہ ز میداں نفرستم

ردیف
"ح"

دعوئے عشقِ بتاں سے بگلستاں گل و صبح
ہیں رقیبانہ بہم دست و گریباں گل و صبح

ساق گلرنگ سے اور آئنۂ زانو سے
جامہ زیبوں کے سدا ہیں تہِ داماں گل و صبح

وصلِ آئینہ رخاں ہم نفسِ یک دیگر
ہیں دعا ہائے سحرگاہ سے خواہاں گل و صبح

آئینہ خانہ ہے صحنِ چمنستاں یکسر
بسکہ ہیں بیخود و وارفتہ و حیراں گل و صبح

زندگانی نہیں بیش از نفسِ چند اسد
غفلت آرامیِ یاراں پہ ہیں خنداں گل و صبح

پیچیدگی ہے حاملِ طومارِ انتظار — پائے نظر بہ دامنِ شوقِ دویدہ کھینچ

برقِ بہار سے ہوں میں پا در حنا ہنوز — اے خارِ دشت! دامنِ شوقِ رسیدہ کھینچ

بیخود بہ لطفِ چشمکِ عبرت ہے چشمِ صید — یک داغِ حسرتِ نفسِ نا کشیدہ کھینچ

بزمِ نظر ہیں بیضۂ طاؤس خلوتاں — فرشِ طرب بہ گلشنِ نا آفریدہ کھینچ

دریا بساطِ دعوتِ سیلاب ہے اسد

ساغر بہ بارگاہِ دماغِ رسیدہ کھینچ

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیچ — رفتار نہیں۔ بیشتر از لغزشِ پا ہیچ،

حیرت ہمہ اسرار پہ مجبورِ خموشی — ہستی نہیں جز بستنِ پیمانِ وفا ہیچ

تمثالِ گداز آئینہ ہے عبرتِ بینش — نظارہ تحیر چمنستانِ بقا ہیچ

گلزارِ دمیدن۔ شررستانِ رمیدن — فرصت تپش و حوصلۂ نشو و نما ہیچ

آہنگِ عدم نالہ بہ کہسار گرو ہے، — ہستی میں نہیں شوخیِ ایجادِ صدا ہیچ

کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنا — سامانِ دعا۔ وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ

آہنگِ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

ردیف
"چ"

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ	تعلی م	اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ جلوہ نہ پوچھ کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ	م	برنگِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ
نہ کہہ کہ طاقتِ رسوائیِ وصال نہیں		اگر یہی عرقِ فتنہ ہے۔ مکرر۔ کھینچ
تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار۔ اے دل	م	کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ
جنونِ آئینہ مشتاقِ یک تماشا ہے		ہمارے صفحے پہ بالِ پری سے مسطر کھینچ
بہ نیم غمزہ ادا کر۔ حقِ ودیعتِ ناز	م	نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ
مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں	م	بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ
تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس	م	بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

خمارِ منتِ ساقی۔ اگر یہی ہے اسدؔ
دلِ گداختہ کے میکدے میں ساغر کھینچ

بے دل نہ نازِ وحشتِ جیبِ دریدہ کھینچ	تعلی	جوں بوئے غنچہ۔ یک نفسِ آرمیدہ کھینچ
یک مشت خوں ہے۔ پرتوِ خور سے تمام دشت		دردِ طلب بہ آبلۂ نادمیدہ کھینچ

قلمی

جنبشِ گلبرگ سے ہے گل کے لب کو اختلاج
شاخِ گل جنبش میں ہے۔ گہوارہ آسا ہر نفس
طفلِ شوخِ غنچۂ گل۔ بسکہ۔ ہے وحشی مزاج
سیرِ ملکِ حسن کر۔ میخانہا نذرِ خمار
چشمِ مستِ یار سے ہے گردنِ مینا پہ باج
گریہ ہائے بیدلاں گنجِ شرر در آستیں
قہرمانِ عشق میں حسرت سے لیتے ہیں خراج
ہے سوادِ چشمِ قربانی میں یک عالم مقیم
حسرتِ فرصت نے بخشا بسکہ حیرت کو رواج

اے اسد ہے مستعدِ شانہ گشتن بہرِ زلف
پنجۂ مژگاں۔ بخود بالیدنی رکھتا ہے آج

مطبوعہ

تو ہم مریضِ عشق کے تیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو۔ تو مسیحا کا کیا علاج

حط اس مشہور شعر کا ہم طرح کوئی شعر قلمی نسخے میں نہیں ملا۔

ردیف
"ج"

گلشن میں بند و بست بہ ضبطِ دگر ہے آج (قلمی)

گلشن میں بند و بست بہ رنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج (م)

ح١ ولی تپش ہوئی افراطِ انتظار
چشمِ کشادہ حلقۂ بیرونِ در ہے آج

حیرت فروشِ صد نگرانی ہے اضطرار
سررشتہ چاکِ جیب کا تارِ نظر ہے آج

ح٢ آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج (م)

اے عافیت کنارہ کر اے انتظار چل
سیلابِ گریہ دشمنِ دیوار و در ہے آج
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج (م)

ہوں داغِ نیم رنگیِ شامِ وصالِ یار
نورِ چراغِ بزم سے جوشِ سحر ہے آج

ح٣ گرمی ہے عاجزی سفرِ سوختن تمام
پیراہنِ خسک میں غبارِ شرر ہے آج

تا صبح ہے بہ منزلِ مقصد رسیدنی
دودِ چراغِ خانہ غبارِ سفر ہے آج

دور اوفتادۂ چمنِ فکر ہے اسدؔ
مرغِ خیال بلبلِ بے بال و پر ہے آج

ح١ یہ شعر مولانا حسرت موہانی اور مولانا نظامی بدایونی کے شائع کردہ دیوانوں کے آخر میں بطور وجہ شمار کے ضمن میں آج ہو
ح٢ یہ معروف شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر غالباً غالب نے اپنے ہاتھ سے بڑھایا ہے۔
ح٣ متن میں پہلے اس کی بجائے یوں تھا۔ "دو بیتابی نے کیا سفرِ سوختن تمام"

یک نگاہ گرم ہے جوں شمع سرتا پا گداز
بہر از خود رفتگاں رنج خود آرائی عبث

قیس بھاگا شہر سے شرمندہ ہو کر سوئے دشت
بن گیا تقلید سے میری یہ سودائی عبث

اے اسدؔ! بیجا ہے نازِ سجدۂ عرضِ نیاز
عالمِ تسلیم میں یہ دعوی آرائی عبث

ع۱ یہ شعر حاشیے پر غالبؔ کے قلم سے بعد میں بڑھایا گیا ہے۔

ردیف
"ث"

دودِ شمع کشتہ گل بزم سامانی عبث
یک شبہ آشفتہ نازِ سنبلستانی عبث

قل

ہے ہوس محمل بہ دوشِ شوخیِ ساقیِ مست
نشۂ مے کے تصور میں نگہبانی عبث

باز ماندنہائے مژگاں ہے بیک آغوشِ وداع
عید۔ در حیرت سوادِ چشم قربانی عبث

جز غبارِ کردہ سیر آہنگیِ پرواز کو؟
بلبلِ تصویر و دعوائے پرافشانی عبث

سرنوشتِ خلق ہے طغرائے عجزِ اختیار
آرزوہا خارخارِ چینِ پیشانی عبث

جبکہ نقشِ مدعا ہووے نہ جز موجِ سراب
وادیِ حسرت میں پھر آشفتہ جولانی عبث

دست برہم سودہ ہے مژگانِ خوابیدہ اسدؔ
اے دل از کف دادۂ غفلت پشیمانی عبث

قل

نازِ لطفِ عشق باوصفِ توانائی عبث
رنگ ہے سنگِ محک دعوائے مینائی عبث

ناخنِ دخلِ عزیزاں یکقلم بے نقب زن
پاسبانیِ طلسمِ گنجِ تنہائی عبث

محمل پیمانۂ فرصت ہے بر دوشِ حباب
دعوئے دریاکشی و نشہ پیمائی عبث

طبعِ عاشق حاملِ صد غلبۂ تاثیر ہے
دل کو اے بیدادخو تعلیمِ خارائی عبث

؎ متن میں یہ شعر پہلے یوں لکھا ہے۔ "طبعِ نالاں حاملِ صد غلبۂ تاثیر ہے ٭ دل کو اے عاشق کشاں تعلیمِ خارائی عبث"

رہے غالبِ خستہ مغلوبِ گردوں
یہ کیا بے نیازی ہے حضرت سلامت

مقطع

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مرے بالیں پہ اُسے - پر کس وقت

ف - یہ ایک ہی شعر مشہور ہے - قلمی نسخے میں اس کا ہمطرح کوئی شعر نہیں ہے -

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے؟
یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ زبس تکرارِ دوست

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت (مم)

جگر کو مرے عشقِ خوں نابہ مشرب
لکھے ہے "خداوندِ نعمت سلامت" (م)

دو عالم کی ہستی پہ خطِ وفا کھینچ
دل و دستِ اربابِ ہمت سلامت

علی الرغمِ دشمن، شہیدِ وفا ہوں
مبارک مبارک سلامت سلامت (م)

نہیں گریہ کام دلِ خستہ گردوں
جگر خواہیے جوشِ حسرت سلامت

نہیں گر سروبرگِ سودائے معنی
نہیں گر سروبرگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت (م)

نہ اوروں کی سنتا نہ کہتا ہوں اپنی
سرِ خستہ دشوارِ وحشت سلامت

ز فورِ بلا ہے ہجومِ وفا ہے
سلامت ملامت ملامت سلامت

نہ فکرِ سلامت، نہ بیمِ ملامت
ز خود رفتگی [رنگی] ہائے حیرت سلامت

حاشیہ: یہ پوری غزل جس کے چار شعر عام طور پر متداول ہیں۔ قلمی نسخے کے حاشیے پر غالباً غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ متن میں نہیں ہے۔

قطعہ

نیم رنگی جلوہ ہے بزمِ تجلی زارِ دوست
آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

چشم بندِ خلق جز تمثالِ خود بینی نہیں
آئینہ ہے قالبِ خشتِ در و دیوارِ دوست

برقِ خرمن زارِ گوہر ہے نگاہِ تیز یاں
اشک ہو جاتے ہیں خشک از گرمیِ رفتارِ دوست

ہے سوا نیزے پہ اس کے قامتِ نوخیز سے
آفتابِ صبحِ محشر ہے گلِ دستارِ دوست

اے عدوئے مصلحت چندے بہ ضبط افسردہ رہ
کردنی ہے جمع تابِ شوخیِ دیدارِ دوست

لغزشِ مستانہ و جوشِ تماشا ہے اسدؔ
آتشِ مے سے بہارِ گرمیِ بازارِ دوست

مطلع

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

خانہ ویراں سازیِ حیرت۔ تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر۔ گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ ما روشن۔ کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

غیر یوں کرتا ہے پرسش مجھ سے اسکے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

تاکہ میں جانوں۔ کہ ہے اُس کی رسائی واں تلک
مجھکو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھکو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

ردیف

"ت"

جاتا ہوں جدھر سب کی اٹھی ہے ادھر انگشت
یکدست جہاں مجھ سے پھرا ہے مگر انگشت

مژگاں کی محبت میں جو انگشت نما ہوں
لگتی ہے مجھے تیر کے مانند ہر انگشت

ہر غنچۂ گل صورتِ یک قطرۂ خوں ہے
دیکھا ہے کسی کا جو حنا بستہ سر انگشت

گرمی ہے زباں کی سبب سوختنِ جاں
ہے شمعِ شہادت کے لیے ہر سرِ انگشت

خوں دل میں جو میرے نہیں باقی تو عجب کیا
جوں ماہیِ بے آب تڑپتی ہے ہر انگشت

شوخی تری کہہ دیتی ہے احوال ہمارا
رازِ دلِ صد پارہ کی ہے پردہ در انگشت

کس رتبہ میں باریکی و نرمی ہے کہ جوں گل
آتی نہیں پنجہ میں بس اس کے نظر انگشت

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

کافی ہے نشانی تری۔ چھلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

یہ شعر مولانا فضل الحسن صاحب حسرت موہانی کے شائع کردہ دیوانِ غالب کے آخر میں غیر مردود اشعار کی ضمن میں لکھا ہوا ہے۔
متن میں پہلا یہ مصرع یوں تھا "خوباں کا جو دیکھا ہے حنا بستہ سر انگشت۔
مقطع سے پہلے کے یہ تین شعر بھی پہلے شامل نہ تھے۔ بعد میں حاشیے پر مرزا غالب کے قلم سے لکھے گئے ہیں۔ اور انہیں کے ساتھ
اصل متن میں وہ [illegible] شعر بھی درج ہیں جو عام طور پر دیوانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور جن کو ہم نے مقطع کے بعد لکھا ہے۔

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے، زہے موسمِ گل	ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

عمر میری ہو گئی صرفِ بہارِ حُسنِ یار — گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب

منع مت کر حُسن کی ہم کو پرستش سے کہ ہے — بادۂ نظارۂ گلشن حلالِ عندلیب

ہے مگر موقوف بروقتِ دگر کارِ اسد — اے شبِ پروانہ و روزِ[ح۱] وصالِ عندلیب

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب — دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن — سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے — سر سے گذرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر — موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو — موجِ گل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

جسقدر روح نباتی ہے جگر تشنۂ ناز — دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر — شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال — ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

نشے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ — بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہے طوفانیِ کیفیتِ فصل — موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

ح۱ متن میں پہلے "صبح" تھا، اس کی جگہ "روز" بنایا ہے۔

ردیف

"ب"[1]

بس کہ ہے میخانہ ویراں جوں بیابانِ خراب	قلمی	عکسِ چشمِ آہوئے رم خوردہ ہے داغِ شراب
تیرگیِ ظاہری ہے طبعِ سوزِ دل کا نشاں		غافلاں عکسِ سوادِ صفحہ ہے گردِ کتاب
یک نگاہِ صاف صد آئینۂ تاثیر ہے		ہے رگِ یاقوت عکسِ خطِ جامِ آفتاب
ہے عرق افشاں سرشکی سے ادہمِ مشکینِ یار		وقتِ شب اختر کُنی ہے چشمِ بیدارِ رکاب
ہے شفق سوزِ جگر کی آگ کی بالیدگی		ہر یک اختر سے فلک پر قطرۂ اشکِ کباب
بسکہ شرمِ عارضِ رنگیں سے حیرت جلوہ ہے		ہے شکستِ رنگِ گل آئینہ پردازِ نقاب

شب کہ تھا نظارگی روئے بتاں کا اسدؔ
گر گیا بامِ فلک سے صبح طشتِ ماہتاب

ہے بہاراں میں خزاں پرور خیالِ عندلیب	قلمی	رنگِ گل آتشکدہ ہے زیرِ بالِ عندلیب
عشق کو ہر رنگ شانِ حُسن ہے مدِّ نظر		مصرعِ سروِ چمن ہے حسبِ حالِ عندلیب
حیرتِ حُسنِ چمن پیرائے تیرِ رنگِ گل		بسملِ ذوقِ[2] پریدن ہے پر و بالِ عندلیب

[1] اس ردیف کی غزلوں میں قلمی اور مروجہ دیوانوں میں بالکل اشتراک نہیں ہے۔ البتہ پوری مروجہ غزل "پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب" قلمی نسخے کے حاشیے پر غالباً غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہے۔

[2] متن میں پہلے "آہنگ" تھا اسے کاٹ کر "ذوق" بنایا ہے۔

پوچھتے ہیں وہ۔ کہ "غالب کون ہے؟"
کوئی بتلاؤ۔ کہ۔ ہم بتلائیں کیا

عشرتِ قطرہ ہے۔ دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے، قسمت میں مری بصورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جُدا ہو جانا

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا۔ گھسنے میں اِس عقدہ کا وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم۔ اللہ اللہ
اسقدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا!

ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے ابرِ بہاری کا۔ برس کر کھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس؟
کیوں ہے؟ گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

تاکہ۔ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ۔ برسات میں۔ سبز آئنہ کا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل، ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

بارے۔ آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا
دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھلادوں
انگلیاں فگار اپنی۔ خامہ خوں چکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا۔ آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے۔ سنگِ آستاں اپنا
تا کرے نہ غمازی۔ کرلیا ہے۔ دشمن کو
دوست کی شکایت میں۔ ہمنے ہمزباں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے۔ کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ۔ دشمن آسماں اپنا

جورسے باز آئے پر۔ باز آئیں کیا
کہتے ہیں: "ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا"
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ۔ گھبرائیں کیا
لاگ ہو۔ تو اُس کو ہم سمجھیں۔ لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی۔ تو دھوکا کھائیں کیا
ہولئے کیوں۔ نامہ بر کے ساتھ ساتھ؟
یارب۔ اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟
موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جاؤ
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا
عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مرگئے پر دیکھئے۔ دکھلائیں کیا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اُس کو کہوں۔ اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

دیکھکر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا؟
نالہ کرتا تھا۔ ولے طالب تاثیر بھی تھا

پیشہ میں عیب نہیں رکھیئے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جوان میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے۔ پاس نہ آیا نہ سہی
آخر۔ اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا۔ دم تحریر بھی تھا

ریختی کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں۔ اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ذکر اُس پری وش کا۔ اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر۔ تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے۔ بزم غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

منظر اک بلندی پر۔ اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا۔ کاشکے مکاں اپنا

دے وہ جسقدر ذلت۔ ہم ہنسی میں ٹالیں گے

درماندگی میں غالب - کچھ بن پڑے - تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا - ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا - جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر - گر بحر نہ ہوتا - تو بیاباں ہوتا

تنگیِ دل کا گلہ کیا - یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا - تو پریشاں ہوتا

بعد یک عمرِ ورع - بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی - درِ یار کا درباں ہوتا

نہ تھا کچھ - تو خدا تھا - کچھ نہ ہوتا - تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے - نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوا جب غم سے یوں بے حس - تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے - تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا - پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا - کہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا"

ہوئی تاخیر - تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اُس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو - تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں - کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا۔ برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟
اک تماشا ہوا۔ گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا۔ لہو نہ تھما
کام گر رک گیا روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے!
لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

میں اور بزم مے سے۔ یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ۔ ساقی کو کیا ہوا تھا؟

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

محابا کیا ہی؟ میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن
شکستِ شیشۂ دل کی صدا کیا

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ؟
شکیبِ خاطرِ عاشق۔ بھلا کیا

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں؟
یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

بلائے جاں ہی غالب اسکی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا۔ ادا کیا

درخورِ قہر و غضب جب۔ کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہی؟ کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی۔ وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ۔ اگر۔ وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو۔ کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

کم نہیں۔ نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار۔ برا کیا ہے؟ گر اچھا نہ ہوا

سینہ کا داغ۔ ہے وہ نالہ۔ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہی وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہی وہ فتنہ۔ کہ برپا نہ ہوا

ہر بنِ مو سے۔ دمِ ذکر۔ نہ ٹپکے خونناب؟
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے؟ اور جزو میں کل؟
کھیل لڑکوں کا ہوا۔ دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے۔ پہ تماشا نہ ہوا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو - کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو - یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے - پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا - غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے - شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا؟ اگر ایک بار ہوتا

ہوئے ہم جو مر کے رسوا - ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا - نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی - تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف! یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے - جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا - تو جینے کا مزا کیا

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا؟
کہاں تک - اے سراپا ناز کیا کیا

نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما - کیا

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

نفس - موجِ محیطِ بیخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا - کیا

دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا - کیا

دلِ ہر قطرہ ہے - سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اس کی امت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند؟
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا؟
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا؟

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے "کیا"

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا؟

گر کیا ناصح نے ہمکو قید اچھا۔ یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہمنے یہ مانا کہ دہلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم۔ تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے؟ اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا۔ کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا۔ اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے۔ ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا۔ کوئی غمگسار ہوتا

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اُس گرہِ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا، اسدؔ
سینہ، کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھُلا
رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھُلا

شب ہوئی، پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھُلا
اِس تکلف سے کہ گویا بتکدہ کا در کھُلا

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں خنجر کھُلا

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں، گو نہ پاؤں اُس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھُلا

ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھُلا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھُلا

در پہ رہنے کو کہا، اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھُلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول
آج اُدھر ہی کو رہے گا؟ دیدۂ اختر کھُلا

کیا رہوں غربت میں خوش؟ جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھُلا

ستائش گر ہے زاہد۔ اسقدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے۔ بیدادِ کاوشہاے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے۔ سروِ چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ۔ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ۔ ویرانی۔ تماشا کر
مدار اب کھاس کے ہے کھودنے پر میرے درباں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ۔ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار۔ باقی ہے
دلِ افسردہ۔ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کے آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہاے پنہاں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو۔ پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے۔ سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری۔ جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے۔ عالم کے اجزاے پریشاں کا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہاے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ۔ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہاے ناز کا

بتاں! زہر آبا اس شدت سے دو پیکانِ ناوک کو
کہ خطِ سبز تا پشتِ لبِ سوفار ہو پیدا

لگے گر سنگ سر پہ یار کے دستِ نگاریں سے
بجائے زخم، گل بر گوشۂ دستار ہو پیدا

کروں گر عرضِ سنگینیِ کہسار اپنی بیتابی
رگِ ہر سنگ سے نبضِ دلِ بیمار ہو پیدا

بسنگِ شیشہ توڑوں ساقیا پیمانۂ پیماں
اگر ابرِ سیہ مست از سوئے کہسار ہو پیدا

اسد مایوس مت ہو، گرچہ رونے میں اثر کم ہے
کہ غالب ہے کہ بعد از زاریِ بسیار ہو پیدا

(۳)

دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی، فرد فرد تھا

دل تا جگر، کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہگذر میں جلوۂ گل، آگے گرد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی؟
دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال، بیاباں نورد تھا

یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

؎ یہاں سے ردیفِ (ا) کی وہ غزلیں شروع ہوئی ہیں جنکا مطلع کوئی شعر قلمی دیواں میں موجود نہیں ہے

غرورِ شوخ ہے طوفان طرازِ شوقِ خونریزی
کہ در بحرِ کماں بالیدہ موجِ تیر ہے پیدا

نہیں ہے کف لبِ نازک پہ فرطِ نشۂ مے سے
لطافت ہائے جوشِ حسن کا شیرہ ہے پیدا

عروجِ نا امیدی چشمِ زخمِ چرخ کیا جانے
بہارِ بے خزاں از آہِ بے تاثیر ہے پیدا

اسد جس شوق سے ذرے تپش فرسا ہوں روزن میں
جراحت ہائے دل سے جوہرِ شمشیر ہے پیدا

بہ مہر نامہ جو بوسہ گلِ پیام رہا
ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام ہوا[1]

ہوا نہ مجھ سے بجز دردِ خالِ صیاد
بسانِ اشک گرفتارِ چشمِ دام رہا

دل و جگر تفِ فرقت سے جل کے خاک ہوئے
و لے ہنوز خیالِ وصال خام رہا

شکستِ رنگ کی لائی سحر شبِ سنبل
پہ زلفِ یار کا افسانہ ناتمام رہا

دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا
کہ شب خیال میں بوسوں کا اژدہام رہا

نہ پوچھ حال شب و روزِ ہجر کا غالب
خیالِ زلف و رخِ دوست صبح و شام رہا

سحر گہ باغ میں وہ حیرتِ گلزار ہو پیدا
اڑے رنگِ گل اور آئینہ دیوار ہو پیدا

[1] متن میں یہ مصرع یونہی درج ہے۔ لیکن اس غزل کی ردیف کی رعایت آخر میں "رہا" کی متقاضی ہے۔ اس لیے شاید یہ مصرع یوں ہو گا:

"ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا"

ہے تنگ ز واماندہ شدن حوصلۂ پا
سرِ منزلِ ہستی سے ہے صحرائے طلب دور
دیدار طلب ہے دلِ واماندہ۔ کہ آخر
آیا نہ بیابانِ طلب کام۔ زباں تک

جو اشک گرا خاک میں۔ ہے آبلۂ پا
جو خط ہے کفِ پا پہ۔ سو ہے سلسلۂ پا
نوکِ سرِ مژگاں سے رقم ہو۔ گلۂ پا
تبخالۂ لب ہو نہ سکا۔ آبلۂ پا

فریاد سے پیدا ہے اسد گرمیِ وحشت
تبخالۂ لب ہے جرسِ آبلۂ پا

بسکہ عاجز نارسائی سے کبوتر ہو گیا
صورتِ دیباچہ تپش کی میری غرقِ خوں ہے آج
بسکہ آئینہ نے پایا گرمیِ رخ سے گداز
شعلہ رخسارا۔ تحیر سے تری رفتار کے
بسکہ وقتِ گریہ نکلا تیرہ کاری کا غبار

صفحۂ نامہ غلافِ بالشِ پر ہو گیا
خارِ پیراہن رگِ نشتر کو نشتر ہو گیا
دامنِ تمثال مثلِ برگِ گل۔ تر ہو گیا
خارِ شمعِ آئینہ۔ آتش میں جوہر ہو گیا
دامنِ آلودۂ عصیاں گراں تر ہو گیا

حیرتِ اندازِ رہبر ہے عنانگیرِ اسد
نقشِ پائے خضریاں سدِ سکندر ہو گیا

گرفتاری میں فرمانِ خطِ تقدیر ہے پیدا
زمیں کو صفحۂ گلشن بنایا خوں چکانی نے

کہ طوقِ قمری از ہر حلقۂ زنجیر ہے پیدا
چمن بالیدنی ہا از رمِ نخچیر ہے پیدا

عیادت سے زبس ٹوٹا ہے دل یارانِ غمگیں کا
نظر آتا ہے موے شیشہ رشتہ شمعِ بالیں کا

صدا ہے کوہ میں حشر آفریں اے غفلت اندیشاں
پے سنجیدنِ یاراں ہے حالِ خوابِ سنگیں کا

بجاے غنچہ و گل ہے ہجومِ خار و خس تا کے
کہ صرفِ بخیۂ دامن ہوا ہے خندہ گلچیں کا

نصیبِ آستیں ہے حاصلِ روے عرق آگیں
چنے ہے کہکشاں خرمن سے مہ کی خوشہ پرویں کا

بوقتِ کعبہ جوئیہا جرس کرتا ہے ناقوسی
کہ صحرا فصلِ گل میں رشک ہے بتخانۂ چیں کا

طپیدن دل کو سوزِ عشق میں خوابِ فرامش ہے
رکھا اسپند نے مجمر میں پہلو گرم تمکیں کا

اسد اربابِ [۱] فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تحسیں کا

وردِ اسمِ حق سے دیدارِ صنم حاصل ہوا
رشتۂ تسبیح تارِ جادۂ منزل ہوا

محتسب سے سنگ ہے از بسکہ کارِ میکشاں
زر میں جو انگور کا عقدۂ مشکل ہوا

قیس نے از بسکہ کی سیرِ گریبانِ نفس
یک وجب دامانِ صحرا پردۂ محمل ہوا

وقتِ شب اس شمع رو کے شعلۂ آواز پر
گوشِ نسریں عارضِ پروانۂ محفل ہوا

عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندی اسد
نقص پر اپنے ہوا جو مطلعِ کامل ہوا

[۱] متن میں یہ مصرع پہلے یوں لکھا تھا۔ "اسد طرز آشنایاں قدر دانِ نکتہ سنجی ہیں"۔ پھر اسے بطرز بالا بدل دیا۔

دیدِ حیرت کش و خورشید چراغانِ خیال
عرضِ شبنم سے چمن آئنہ تعمیر آیا

عشقِ ترسا بچہ و نازِ شہادت مت پوچھ
کہ کلہ گوشہ بہ پروازِ پرِ تیر آیا

اے خوشا ذوقِ تمنائے شہادت کہ اسد
بے تکلف بہ جودِ خمِ شمشیر آیا

سیر آں سوئے تماشا ہے طلبگاروں کا
خضر مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا

سرِ خطِ بند ہوا نامہ گنہگاروں کا
خونِ ہر ہدے لکھا نقش گرفتاروں کا

فرد آئینہ میں بخشیں شکنِ خندۂ گل
دلِ آزردہ پسند آئینہ رخساروں کا

داد خواہِ تپش و مہرِ خموشی برلب
کاغذِ سرمہ ہے جامہ تری بیماروں کا

وحشتِ نالہ بہ واماندگیِ وحشت ہے
جرسِ قافلہ یاں دل ہے گرانباروں کا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

جلوہ مایوس نہیں دل نگرانی غافل
چشمِ امید ہے روزن تری دیواروں کا

اسد اے ہرزہ درا نالہ بہ غوغا تا چند
حوصلہ تنگ نہ کر بے سببِ آزاروں کا

لے یہ شعر دیوانِ غالب شائع کردہ مولانا حسرت موہانی اور دیوانِ غالب مطبوعہ مطبع نظامی بدایونی کی طبع ثانی کے آخر میں غالب کے غیر مروجہ اشعار کی ضمن میں شائع کیا گیا ہے۔

شامِ فراقِ یار میں جوشِ خیرہ سری سے ہم اسد
ماہ کو در تسبیح کواکب جائے نشینِ امام کیا

کیا کس شوخ نے ناز از سرِ تمکیں نشستن کا
کہ شاخِ گل کا خم انداز ہے بالیدن شکستن کا

نہاں ہے مردمک میں شوقِ رخسارِ فروزاں کی
سپندِ شعلۂ نادیدہ مفت انداز جستن کا

گداز دل کو کرتی ہے کشودِ چشمِ شب پیما
نمک ہے شمع میں موجِ صبا و خواب بستن کا

نفس در سینہ ہائے ہمدگر رہتا ہے پیوستہ
نہیں ہے رشتۂ الفت کو اندیشہ گسستن کا

ہوائے ابر سے کی موسمِ گل میں نمد بافی
کہ تھا آئینۂ خور پر تصور رنگ بستن کا

تکلف عافیت میں ہے دلا بندِ قبا وا کر
نفس بعد از وصالِ دوستاں ہے کہ گستن کا

بر اشکِ چشم سے یک حلقۂ زنجیر بڑھتا ہے
بہ بندِ گریہ ہے نقش بر آب اندیشہ رفتن کا

عیادت سے اسد میں بیشتر بیمار رہتا ہوں
سبب ہے ناخنِ دخلِ عزیزاں سینہ خستن کا

شب کہ دل زخمیِ عرضِ دو جہاں تیر آیا
نالہ بر خود غلطِ شوخیِ تاثیر آیا

وسعتِ جیبِ جنوں بیش دل مت پوچھ
محملِ دشت بدوشِ رمِ نخچیر آیا

بے گرفتاریِ نیرنگِ تماشا ہستی
پرِ طاؤس سے دل پائے بہ زنجیر آیا

۱؎ یہ اور اس کے بعد کے دو شعر متن میں نہیں ہیں بلکہ بعد میں حاشیے پر بڑھائے گئے ہیں (ملاحظہ ہو حاشیہ ۳۲)

یک گام بیخودی سے لوٹیں بہارِ صحرا
آغوشِ نقشِ پا میں کیجے فشارِ صحرا

وحشت اگر رسا ہے۔ بیحاصلی ادا ہے
پیمانۂ ہوا ہے۔ مشتِ غبارِ صحرا

اے آبلہ کرم کر۔ یاں رنجہ اک قدم کر
اے نورِ چشمِ وحشت۔ اے یادگارِ صحرا

دل در رکابِ صحرا۔ خانہ خرابِ صحرا
موجِ سرابِ صحرا۔ عرضِ خمارِ صحرا

ہر ذرہ یک دلِ پاک۔ آئینہ خانۂ خاک
تمثالِ شوقِ بیباک صد جا دوچارِ صحرا

دیوانگی اسدؔ کی حسرت کشِ طرب ہے
در سر ہوائے گلشن۔ در دل غبارِ صحرا

وحشی بن صیاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا
رشتۂ چاکِ جیبِ دریدہ صرفِ قماشِ دام کیا

عکسِ رخِ افروختہ تھا تصویر بہ پشتِ آئینہ
شوخ نے وقتِ حسن طرازی تمکیں سے آرام کیا

ساقی نے از بہرِ گریباں چاکئ موجِ بادۂ ناب
تارِ نگاہِ سوزنِ مینا رشتۂ خطِ جام کیا

مہر بجائے نامہ لگائی بر لبِ پیکِ نامہ رساں
قاتلِ تمکیں سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا

انتظارِ[1] جلوۂ کاکل میں ہر شمشادِ باغ
صورتِ مژگانِ عاشق صرفِ نقشِ شانہ تھا

حیرت اپنی نالۂ بیدرد سے غفلت بنی
راہِ خوابیدہ کو غوغائے جرس افسانہ تھا

گو بوقتِ قتل حق آشنائی اے نگاہ
خنجرِ زہر آب دادہ سبزۂ بیگانہ تھا

جوش بے کیفیتی ہے اضطرابِ آب را اسدؔ
ورنہ بسمل کا تڑپنا[2] لغزشِ مستانہ تھا

کرے گر حیرتِ نظارہ طوفاں نکتہ گوئی کا
حبابِ چشمۂ آئینہ ہو بیضہ طوطی کا

بروئے قیس دستِ شرم ہے مژگانِ آہو سے
مگر روزِ عروسی گم ہوا تھا شانہ لیلیٰ کا

فسانِ تیغِ نازک قاتلاں سنگِ جراحت ہے
دلِ گرم تپش قاصد ہے پیغامِ تسلی کا

نہیں گرداب جز سرگشتگی ہائے طلب ہرگز
حبابِ بحر کے ہے آبلوں میں خارِ ماہی کا

نیازِ جلوہ ریزی طاقتِ بالیں شکستن ہا
تکلف کو خیال آیا ہو گر بیمار پرسی کا

بیکجشی فرصتِ یک شبنمستاں جلوۂ خور نے
تصور نے کیا ساماں ہزار آئینہ بندی کا

اسدؔ تاثیرِ صافی ہائے حیرت جلوہ پرور ہو
گر آبِ چشمۂ آئینہ ہوئے عکسِ زنگی کا

[1] متن میں یہ شعر پہلے یوں لکھا گیا تھا۔
انتظارِ زلف میں شمشاد ہمدستِ چنار
نقشبندِ شکلِ مژگاں از نمودِ شانہ تھا

[2] متن میں پہلے اس جگہ "طپیدن" تھا پھر اسے کاٹ کر "تڑپنا" بنا دیا گیا

رات دل گرمِ خیالِ جلوۂ جانانہ تھا
رنگِ روئے شمع برقِ خرمنِ پروانہ تھا

شب کہ تھی کیفیتِ محفل بیادِ روئے یار
ہر نظر داغِ مئے خالِ لبِ پیمانہ تھا

شب کہ باندھا خواب میں آنکھ کا غافل بھی خلل
وہ فسونِ وعدہ میرے واسطے افسانہ تھا

دود کو آج اُس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی
وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمعِ ماتم خانہ تھا

ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا
تو کہے صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

دیکھ اُس کے ساعدِ سیمین و دستِ پُر نگار
شاخِ گل جلتی تھی مثلِ شمع گل پروانہ تھا

اے اسد رویا جو دشتِ غم میں میں حیرت زدہ ل
آئینہ خانہ ہجومِ اشک سے ویرانہ تھا

بسکہ جوشِ گریہ سے زیر و زبر ویرانہ تھا
چاکِ موجِ سیل تا پیراہنِ دیوانہ تھا

داغِ مہرِ ضبط جیبِ مستیٔ سعی پسند
دودِ مجمر لالہ ساں دُردِ تہِ پیمانہ تھا

وصل میں بختِ رسائے سنبلستاں گل کیا
رنگِ شب تہ بندیٔ دودِ چراغِ خانہ تھا

شب تری تاثیرِ سحرِ شعلۂ آواز سے
تارِ شمع آہنگِ مضرابِ پرِ پروانہ تھا

موسمِ گل میں مئے گلگوں حلالِ میکشاں
عقدِ وصلِ دخترِ رز انگور کا ہر دانہ تھا

ل یہ شعر دیوانِ غالب مطبوعہ مطبعِ نظامی بدایوں کے آخر میں غیر مروجہ اشعار کی ضمن میں درج ہے اور اس کے ساتھ ایک شعر یہ بھی لکھا ہوا ہے جو قلمی دیوان میں نہیں ہے

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالب ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

لٹا دے گرد رہ بزم میکشی پر تیرہ شفقت کو
بھرے پیمانۂ صد زندگانی ایک جام اس کا

اسد سود لے سرسبزی ہے تسلیم رنگیں سے
کہ کشتِ خشک اس کا ابر بے پروا خرام اس کا

یاد روزے کہ نفس در گرہ[۱] یارب تھا
نالۂ دل بہ کمر دامن قطع شب تھا

بہ تحیر کدۂ فرصتِ آرائشِ وصل
دل شب آئینہ دارِ تپش کوکب تھا

بہ تمنا کدۂ حسرتِ ذوقِ دیدار
دیدہ گو خوں ہو تماشائے چمن مطلب تھا

جوہرِ فکر پر افشانئ نیرنگِ خیال
حسن آئینہ و آئینہ چمن مشرب تھا

پردۂ دردِ دل آئینۂ صد رنگِ نشاط
بخیۂ زخم جگر خندۂ زیرِ لب تھا

نالہ ہا حاصل اندیشہ کہ جوں کشتِ سپند
دل ناسوختہ آتش کدۂ صد تب تھا

عشق میں[۲] ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا
ورنہ جو چاہیے اسباب تمناسب تھا

آخر کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا
دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا

شوق سامانِ فضولی ہے وگرنہ غالب
ہم میں سرمایۂ ایجادِ تمنا کب تھا

[۱] حاشیے پر "در گرہ" کی جگہ "سلسلہ" بنایا ہے۔
[۲] یہ آخری تینوں شعر بھی دیوان کے حاشیے پر درج ہیں اور غالباً نظرثانی کے وقت شاعر نے بڑھائے ہیں۔ قرین قیاس ہے کہ مقطع ابتداءً یوں تھا: باب ابرام نہ تھا دل ہی ہمارا غالب ؎ ورنہ جو چاہیے اسباب تمناسب تھا۔ مگر اسے بدلا لکھ کر اس کی یہ اصلاح کی ہے۔

[۱] بشغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شب ہا
سرِ تارِ نظر ہے رشتۂ تسبیحِ کوکب ہا

کرے گر فکرِ تعمیرِ خرابی ہائے دل گردوں
نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیرونِ قالب ہا

عیادت ہائے طعن آلودِ یاراں زہرِ قاتل ہے
رفوئے زخم کرتی ہے بنوکِ نیشِ عقرب ہا

کرے ہے حسنِ خوباں پردہ میں مشاطگی اپنی
کہ ہے تہ بندیِ خطِ سبزۂ خطِ درتہ لب ہا

فنا کو عشق ہے بے مقصداں حیرت پرستاں
نہیں رفتارِ عمرِ تیز رو پابندِ مطلب ہا

اسد کو بت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے
نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں در پردہ یا رب ہا

[۲] بہ رہنِ شرم ہے با وصفِ شہرت اہتمام اُس کا
نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اُس کا

سرو کارِ تواضع تاخمِ گیسو رسانیدن
بسانِ شانہ زینت ریز ہے دستِ سلام اُس کا

مستی آلودہ ہے مہرِ نوازش نامہ پیدا ہے
کہ داغِ آرزوئے بوسہ لایا ہے پیام اُس کا

بہ امیدِ نگاہِ خاص ہوں محملکشِ حسرت
مبادا ہو عنان گیرِ تغافل لطفِ عام اُس کا

[۱] اس غزل کے پہلے دوسرے اور چوتھے شعر کے ساتھ غالب کی ایک فارسی غزل کے تین شعر قابلِ دید ہیں کہتے ہیں

بشغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شب ہا
سرِ تارِ نفس شد رشتۂ تسبیحِ کوکب ہا

کند گر فکرِ تعمیرِ خرابیہائے ما گردوں
نیاید خشت مثلِ استخواں بیروں ز قالب ہا

ندارد حسن در ہر حال از مشاطگی غفلت
بود تہ بندیِ خطِ سبزہ خط درتہ لب ہا

معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اشعار کو اردو دیوان سے خارج کر دینے کے بعد غالب نے ان کو کھینچ کر فارسی دیوان میں داخل کر لیا

[۲] یہ تینوں شعر مولانا حسرت موہانی اور مولانا نظامی بدایونی کے شائع کردہ دیوانوں کے آخر میں غیر مروجہ اشعار کے ضمن میں درج ہیں۔ عام دیوانوں میں اس غزل کا کوئی شعر نہیں ملتا۔

نزاکت ہے فسونِ دعویٰ طاقت شکستن ہا
شرارِ سنگ اندازِ چراغ از جسم خستن ہا

سیہ مستیِ چشمِ شوخ سے ہیں جوہرِ مژگاں
شرار آسا ز سنگِ سرمگیں بیروں جستن ہا

ہوا نے ابر سے کی موسمِ گل میں نمد بانی
کہ تھا آئینہ خور بے نقابِ زنگ بستن ہا

دل از اضطراب آسودہ طاعت گاہِ داغ آیا
برنگِ شعلہ ہے ہر نماز از پا نشستن ہا

تکلف عافیت میں ہے دلا بندِ قبا وا کر
نفس ہا بعدِ وصلِ دوست داماں تا گسستن ہا

اسد ہر اشک ہے یک حلقہ بر زنجیرِ افزودن
بہ بندِ گریہ ہے نقشِ بر آب امید رستن ہا

بسانِ جوہرِ آئینہ از ویرانیٔ دلہا
غبارِ کوچہ ہائے موج ہے خاشاکِ ساحلہا

نگہ کی ہے بنے پیدا رشتۂ ربطِ علائق سے
ہوئے ہیں پردہ ہائے چشمِ عبرت جلوہ حائلہا

نہیں ہے باوجودِ ضعف سیرِ بیخودی آساں
رہِ خوابیدہ میں افگندنی ہے طرحِ منزلہا

خوشی ہے بہرِ تسکینِ ہوس درکار ہے ورنہ
بہ وہم زر گرہ میں باندھتے ہیں برقِ حاصلہا

تماشا کردنی ہے انتظار آبادِ حیرانی!
نہیں غیر از نگہ جوں نرگستاں فرشِ محفلہا

اسد تارِ نفس ہے ناگزیرِ عقدہ پیرائی
بنوکِ ناخنِ شمشیر کیجے حلِ مشکلہا

لہ ان نشان زدہ اشعار کے ساتھ صفحہ ۹ کی پہلی غزل کا پانچواں چھٹا اور ساتواں شعر بھی قابل ملاحظہ ہیں غالباً دونوں غزلیں ایک ہی ہیں

خود آرا وحشتِ چشمِ پری سے شب وہ بدخو تھا (۲) کہ موم آئینۂ تمثال کو تعویذِ بازو تھا

بہ شیرینی خواب آلودہ مژگاں نشترِ زنبور
خود آرائی سے آئینہ طلسمِ مومِ جادو تھا

نہیں ہے بازگشتِ سیل غیر از جانبِ دریا
ہمیشہ دیدۂ گریاں کو آبِ رفتہ در جو تھا

رہا نظارہ وقتِ بے نقابیہا بجو دارِ لب
سرِ شک آگیں مژہ سے دستِ از جاں شستہ بر رو تھا

غمِ مجنوں عزاداران لیلیٰ کا پرستش گر
خمِ رنگِ سیاہ از حلقہ ہائے چشمِ آہو تھا

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخنِ بریدہ ابرو تھا

اسد خاکِ درِ میخانہ اب سر پر اڑاتا ہوں
گئے وہ دن کہ پانی جامِ مے کا تا بزانو تھا

دمیدن کے کمیں چوں ریشہ زیرِ زمیں پایا
بجز و سر ہوا انداز نگاہِ شرمگیں پایا

لگے اک پنبۂ روزن سے بھی چشمِ سفید آخر
حیا کو انتظارِ جلوہ ریزی کے کمیں پایا

بحسرت گاہِ نازِ کشتۂ جاں بخشیِ خوباں
خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے تر جبیں پایا

پریشانی سے مغزِ سر ہوا ہے پنبۂ بالش
خیالِ شوخیِ خوباں کو راحت آفریں پایا

نفس حیرت پرستِ طرزِ ناگیرائیِ مژگاں
مگر یک دستِ دامانِ نگاہِ واپسیں پایا

اسد کو پیچتابِ طبعِ برقِ آہنگ مسکن ہے
حصارِ شعلۂ جوالہ میں عزلت گزیں پایا

۵۵۔ یہاں سے ردیف الف کی وہ غزلیں شروع ہوتی ہیں جنکا ایک بھی شعر مشہور دیوان میں موجود نہیں ہے۔

کل اسد کو ہمنے دیکھا گوشۂ غمخانہ میں | دست بر سر سر بزانوئے دل مایوس تھا

مطلع

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کسقدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

عالمِ بے سروسانیِ فرصت مت پوچھ
لنگرِ وحشتِ مجنوں ہے بیاباں میرا

بے دماغِ تپشِ رشک ہوں، اے جلوۂ حسن
تشنۂ خونِ دل و دیدہ ہے پیکاں میرا

فہمِ زنجیریِ بے ربطیِ دل ہے یارب!
کس زباں میں ہے لقبِ خوابِ پریشاں میرا

بہ ہوس دردِ سرِ اہلِ سلامت تا چند
مشکلِ عشق ہوں، مطلب نہیں آساں میرا

بوئے یوسف مجھے گلزار سے آتی تھی اسد
دے نے برباد کیا پیرہنستاں میرا

مطبوعہ

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

قلمی

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ[1] ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

م

حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دل بہ دل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا

بت پرستی ہے بہارِ نقش بندیہائے دیر
ہر صریرِ خامہ میں یک نالۂ ناقوس تھا

غنچۂ[2] خاطر سے رنگِ صد گلستاں گل کیا
گردۂ تصویرِ گلشن بیضۂ طاؤس تھا

م

پوچھ مت بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں

---

[1] متن میں یہ مصرعہ پہلے یوں تھا: "شمع سے یک خار در پیراہن فانوس تھا" پھر اسکی اس صورت میں اصلاح کی گئی۔
[2] متن میں اس شعر پر "لا انتخاب" اور حاشیے پر اس کا ہم قافیہ یہ شعر لکھا ہے۔

طبع کے واشد نے رنگِ یک گلستاں گل کیا
یہ دلِ وابستہ گویا بیضۂ طاؤس تھا

ہر چند ہوں میں طوطیِ شیریں سخن ولے
آئینہ۔ آہ میرے مقابل نہیں رہا

انداز نالہ یاد ہیں سب مجھ کو پر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

سلہ

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ۔ درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر۔ کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ۔ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا۔ رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی۔ کہ واں
حاصل۔ سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا۔ مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

نمی

خلوتِ آبلۂ پا میں ہے جولاں میرا
خوں ہے دل تنگیِ وحشت سے بیاباں میرا

ذوقِ[1] سرشار سے بے پردہ ہے طوفاں میرا
موجِ خمیازہ ہے ہر زخمِ نمایاں میرا

عیش بازیچۂ حسرت جاوید رہا
خونِ آدینہ سے رنگیں ہے دبستاں میرا

حسرت نشۂ وحشت نہ بسعیِ دل ہے
عرضِ خمیازۂ مجنوں ہے گریباں میرا

م

سرمۂ مفتِ نظر ہوں۔ مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

[1] یہ شعر قلمی دیوان میں حاشیے پر بعد میں بڑھایا گیا ہے۔

تو دوست کسو کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا [۱]	م	اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے	م	خورشید- ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق- باندازۂ ہمت- ہے ازل سے	م	آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم	م	میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں	م	یعنی سبقِ شوقِ مکرر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی- تنک آبی سے ہوا خشک	م	میرا سرِ دامن بھی- ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی اسد- داغِ جگر سے مری تحصیل آتشکدہ- جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا	م

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا	م	جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
جاں دادگاں کا حوصلہ فرصت گداز ہے		یاں عرصۂ تپیدنِ بسمل نہیں رہا
ہوں قطرہ زن بوادیِ حسرت شبانہ روز		جز تارِ اشک جادۂ منزل نہیں رہا
بروئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے	م	یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
اے آہ میری خاطرِ وابستہ کے سوا		دنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا

[۱] یہ پوری غزل دونوں دیوانوں میں بالکل مشترک ہے۔ البتہ مطلع میں مروجہ دیوان میں "کسو" کی بجائے "کسی" ہے جس سے محاورہ و زبان کی تدریجی اصلاح کا پتہ لگتا ہے۔ غالب نے خود ایک خط میں یہ تصریح لکھ دی ہے کہ قافیے کی ضرورت کے سوا اس کے اشعار میں ہر جگہ "کسو" کی بجائے "کسی" پڑھنا چاہیے (دیوانِ غالب مطبوعہ حسرت موہانی ص ۱۲)

دل نہیں تجھ کو دکھاتا۔ ورنہ داغوں کی بہار ‏ ‏ اس چراغاں کا کروں کیا۔ کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ‏ نعم ‏ دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ‏ م ‏ پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
عذرِ واماندگی۔ اے حسرتِ دل ‏ م ‏ نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا۔ یعنی ‏ م ‏ پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ‏ م ‏ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں ‏ م ‏ دل کے پردے میں جگر یاد آیا
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ ‏ ‏ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی ‏ [۱] ‏ کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی ‏ ‏ گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال ‏ ‏ دلِ گم گشتہ مگر۔ یاد آیا

[۱] یہ شعر قلمی دیوان کے حاشیے پر درج ہے۔

اے بہ ضبطِ حالِ نا افسردگاں جوشِ جنوں / نشۂ مے ہے اگر یک پردہ نازک تر ہوا

اس چمن میں ریشہ داری جس نے سر کھینچا اسدؔ / تر زبانِ لطفِ عامِ ساقیِ کوثر ہوا

مطبوعہ

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا / غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

قلمی

اُف نہ کی گو سوزِ دل سے بے محابا جل گیا / آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا

دود میرا سنبلستاں سے کرے ہے ہمسری / بسکہ شوقِ آتشِ گل سے سراپا جل گیا

شمع رویاں کی سرانگشتِ حنائی دیکھ کر / غنچۂ گل پرفشاں پروانہ آسا جل گیا

خانمانِ عاشقاں دوکانِ آتشباز ہے / شعلہ رویاں جب ہوئے گرمِ تماشا جل گیا

تا کجا افسوسِ گرمیہائے صحبت اے خیال / دل ز آتش خیزیِ[۱] داغِ تمنا جل گیا

ہے اسدؔ بیگانۂ افسردگی اے بیکسی / دل ز اندازِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

مطبوعہ

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں / آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا / میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں / کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

۱ے حاشیے پر "آتش خیزی" کی بجائے "سوزِ آتش" بنایا ہے۔

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا
م شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی ہے دانا اسدؔ
م دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
مجو یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائیگا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا

باغ میں مجھ کو نہ لیجا - ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائیگا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
قلمی خطِ جامِ بادہ یکسر رشتۂ گوہر ہوا
م خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

گرمیِ دولت ہوئی آتش زنِ نامِ نکو
خانۂ خاتم میں یاقوتِ نگیں اخگر ہوا

نشہ میں گم کردہ رہ آیا وہ مستِ فتنہ خو
آج رنگِ رفتہ دورِ گردشِ ساغر ہوا

درد سے در پردہ دی مژگاں سیاہاں نے شکست
ریزہ ریزہ استخواں کا پوست میں نشتر ہوا

زہد گر دیدن ہے گردِ خانہ ہائے منعماں [1]
دانۂ تسبیح سے میں مہرہ در ششدر ہوا

[1] متن میں اس شعر پر لا لا لکھا ہوا ہے اور حاشیہ پر اسکی جگہ یہ مقطع شعر لکھا ہے۔ اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا الخ

واے دیوانگیِ شوق۔ کہ ہر دم مجھ کو	م	آپ جانا اُدہر۔ اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ ازبسکہ تقاضاے نگہ کرتا ہے	م	جوہرِ آئینہ بھی۔ چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرتِ قتل گہ اہلِ تمنا مت پوچھ	م	عید نظارہ ہے۔ شمشیر کا عریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمناے نشاط	م	تو ہو۔ اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا
عشرتِ پارۂ دل۔ زخمِ تمنا کھانا	م	لذتِ ریشِ جگر۔ غرقِ نمکداں ہونا
کی مرے قتل کے بعد۔ اُس نے جفا سے توبہ	م	ہاے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا
م

گر نہ احوالِ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا	قلمی م	بے تکلف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہو جائیگا
زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب	م	پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائیگا
گر وہ مستِ ناز تمکیں دے صلائے عرضِ حال		خارِ گل۔ بہرِ دہانِ گل زباں ہو جائیگا
لے تو لوں سوتے میں اُسکے بوسہ ہاے پا مگر لے تو لوں سوتے میں اُسکے پاؤں کا بوسہ مگر	م	ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا
گر شہادت آرزو ہے۔ نشہ میں گستاخ ہو		بالِ شیشے کا رگِ سنگِ فساں ہو جائیگا

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا	قلمی م	یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا
بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی	م	کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا
تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے	م	تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا
بے خونِ دل ہے چشمِ جنوں میں نگہ غبار بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار	م	یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا
باغِ شگفتہ تیرا بساطِ ہوائے دل باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل	م	ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا
جوشِ بہار کلفتِ نظارہ ہے اسدؔ		ہے ابر پنبہ روزنِ دیوارِ باغ کا
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل	مروجہ	کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا	قلمی م	آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی	م	در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

؎ یہ دو شعر قلمی دیوان کے حاشیے پر درج ہیں
؎ یہ غزل بلا رد و بدل بجنسہ قلمی اور مروجہ دیوان میں مشترک ہے بلکہ لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں ہے

جاں در ہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ جاں در ہوائے یک نفسِ گرم ہے اسدؔ	م	پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا
رحمت اگر قبول کرے۔ کیا بعید ہے	مطبوعہ	شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے		پُر گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا
خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا	قلمی	بیکسی میری شریک آئینہ تیرا آشنا
آتش موئے دماغ شوق ہے تیرا تپاک		ورنہ ہم کس کے ہیں اے داغِ تمنا آشنا
بے دماغی شکوہ سنج رشکِ ہمدیگر نہیں		یار تیرا جامِ مے۔ خمیازہ میرا آشنا
جوہر آئینہ جز رمز سرِ مژگاں نہیں		آشنا کی ہم دگر سمجھے ہے ایما آشنا
ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار		سبزہ بیگانہ۔ صبا آوارہ۔ گل نا آشنا
ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے	م	گردشِ مجنوں بہ چشمکہائے لیلیٰ آشنا
کوہکن نقاش یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ	م	سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا
رشک کہتا ہے۔ کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف	سلیم	عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
شوق ہے۔ ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز		ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ۔ دریا آشنا
میں۔ اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے		عافیت کا دشمن۔ اور آوارگی کا۔ آشنا
شکوہ سنجِ رنگ ہمدیگر۔ نہ رہنا چاہیے		میرا۔ زانو مونس۔ اور۔ آئینہ تیرا۔ آشنا

ہر رنگ میں جلا اسدِ فتنہ انتظار
پروانۂ تجلیِ شمعِ ظہور تھا

بہار رنگِ خونِ گل ہے ساماں اشکباری کا	تی	جنونِ برق نشتر ہے۔ رگِ ابرِ بہاری کا
برائے حلِ مشکل ہوں۔ ز پا افتادہ حسرت		بندھا ہے عقدۂ خاطر سے پیماں خاکساری کا
حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل	م	جہاں ساقی ہو تو۔ باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا
بوقتِ سرنگونی ہے تصور انتظارستاں		نگہ کو۔ آبلوں سے شغل ہے اختر شماری کا
لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی	م	چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اسد ساغر کشِ تسلیم ہو گردش سے گردوں کی
کہ ننگِ فہمِ مستاں ہے گلہ بدروزگاری کا

طاؤس در رکاب ہے ہر ذرہ آہ کا	تی	یا رب نفس غبار ہے کس جلوہ گاہ کا
عزلت گزینِ بزم ہیں۔ واماندگانِ دید		مینائے مے ہے آبلہ پائے نگاہ کا
ہر گام آبلے سے ہے دل در تہِ قدم		کیا بیم اہلِ درد کو سختیِ راہ کا
غافل بوہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں	م	بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا
جیبِ نیازِ عشق نشاندارِ ناز ہے		آئینہ ہوں شکستنِ طرفِ کلاہ کا
بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ	م	صیدِ ز دام جستہ ہے اس دامگاہ کا

شگفتن کمیں دارِ تقریب جوئی
تصور ہوں بے موجبِ آزردگاں کا

زیبِ بدرجستہ باز گشتن
سخن ہوں سخن بر لبِ آوردگاں کا

سراپا یک آئینہ دارِ شکستن
ارادہ ہوں یک عالم افسردگاں کا

ہمہ نا امیدی - ہمہ بدگمانی م
میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

بصورت تکلف بمعنی تاسف
اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دور تھا می
اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا

اے وائے غفلتِ نگہِ شوق ورنہ یاں
ہر پارہ سنگ لختِ دلِ کوہِ طور تھا

درسِ تپش ہے برق کو اب اُس کے نام سے
وہ دل ہے یہ کہ جسکا تخلص صبور تھا

شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھ کر
پیمانہ رات ماہ کا لبریز نور تھا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے م
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے م
ہاں اِس معاملے میں تو میرا قصور تھا
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

جنت ہے تیری تیغ کے کشتوں کی منتظر
جوہر سوادِ جلوۂ مژگانِ حور تھا

لہ یہ شعر متن میں نہیں ہے حاشیے پر درج ہے۔ غالباً نظرِ ثانی کے وقت بڑھایا گیا ہے۔

صبحِ قیامت ایک دُمِ گرگ تھی اسد — جس دشت میں وہ شوخِ دو عالم شکار تھا

اک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب — خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں — جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

زبس خوں گشتۂ رشکِ وفا تھا وہم بسمل کا — چرایا زخمہائے دل نے پانی تیغِ قاتل کا

نگاہِ چشمِ حاسد وام لے اے ذوقِ خودبینی — تماشائی ہوں وحدت خانۂ آئینۂ دل کا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

شررِ فرصت نگہ سامانِ یک عالم چراغاں ہے — بقدرِ رنگ یاں گردش میں ہے پیمانہ محفل کا

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی — جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

سراسر تاختن کو شش جہت یک عرصہ جولاں تھا — ہوا وا ماندگی سے رہرواں کی فرقِ منزل کا

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا — زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

ـه متن میں پہلے یہ مصرع یوں لکھا گیا تھا۔ "مجھے راہِ قطع رہ میں" الخ اسے کاٹ کر یہ اصلاح کی گئی ہے۔

مرا شمول ہر اک دل کے پیچ و تاب میں ہے — میں مدعا ہوں تپشنامۂ تمنا کا

نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے — م — مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں تجھکو یاد اسدؔ — اگرچہ گمشدہ ہے کار و بارِ دنیا کا

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی — سچ — دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا

ہنوز محرمیٔ عشق کو ترستا ہوں — کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُسکو یاد اسدؔ
جفا میں اُس کی ہے انداز کارفرما کا

کس کا خیال آئینۂ انتظار تھا — قلمی — ہر برگِ گل کے پردے میں دل بیقرار تھا

کس کا جنونِ دید تمنا شکار تھا — آئینہ خانہ وادیٔ جوہر غبار تھا

چوں غنچہ و گل آفتِ فالِ نظر نہ پوچھ — پیکاں سے تیرے جلوۂ زخم آشکار تھا

اب میں ہوں اور خونِ دو عالم معاملہ
اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو — م — توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

دیکھی وفائے فرصتِ رنج و نشاطِ دہر — خمیازہ یک درازیٔ عمرِ خمار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا بیاں نہ پوچھ
موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال — م — ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ	م	اس قدر تنگ ہوا دل - کہ میں زنداں سمجھا
ہمنے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع		شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا
تھا گریزاں مژۂ یار سے دل، تا دمِ مرگ	م	دفعِ پیکانِ قضا، اس قدر آساں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا	م	نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی	م	ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا
بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام	م	رُخ پہ ہر قطرہ عرق - دیدۂ حیراں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اُسکو - وفادار اسدؔ
غلطی کی - کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا
م

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا	تم	گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور جوابِ نامۂ شوق یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب	م	مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا
غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو	م	مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
نہ پائی وسعتِ جولانِ یک جنوں ہمنے		عدم کو لے گئے دل میں غبارِ صحرا کا

لہ حاشیے پر اس مصرع کو یوں لکھا ہے۔ "ملی نہ وسعتِ جولانِ یک جنوں ہم کو"

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے	مطبو	چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا	قلمی	تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا	م	جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
ہوں چراغانِ ہوس جوں کاغذِ آتش زدہ		داغ گرمِ کوششِ ایجادِ داغِ تازہ تھا
مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے؟	م	خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن	م }	دستِ پابندِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا دستِ مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا
دیدۂ تر نے دیے اوراقِ لختِ دل بہ آب نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بہ باد	م }	یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

بینوائی تر صدائے نغمۂ شہرت اسدؔ
بوریا یک نیستاں عالم بلند آوازہ تھا

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا	قلمی	رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا
یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز	م	چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے۔ شرمِ نارسائی کا	نحم	بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعوی پارسائی کا
جہاں مٹ جائے سعیِ دید خضر آبادِ آسائش		بجیبِ ہر نگہ پنہاں ہے حاصل رہنمائی کا
بعجز آبادِ وہمِ مدعا تسلیم شوخی ہے		تغافل کو نہ کر معروف[له] تمکیں آزمائی کا
زکوٰۃِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا	م	چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا
نہ مارا جان کر بے جرم۔ غافل۔ تیری گردن پر	م	رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا
دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو۔ زنجیرِ رسوائی	م	عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

اسدؔ کا قصہ طولانی ہے۔ لیکن مختصر یہ ہے
کہ حسرت کش رہا عرضِ ستمہائے جدائی کا

نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بیوفائی کا	مجم	بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعوی پارسائی کا
ہوس گستاخیِ آئینہ تکلیفِ نظر بازی		بجیبِ آرزو پنہاں ہے حاصل دلربائی کا
نظر بازی طلسمِ وحشت آبادِ پرستاں ہے		رہا بیگانۂ تاثیر افسوں آشنائی کا
نہ پایا دردمندِ دوریِ یارانِ یکدل نے		سوادِ خطِ پیشانی سے نسخہ مومیائی کا
تمنائے زبان محوِ سپاسِ بے زبانی ہے	م	مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست و پائی کا
اسدؔ یہ عجز و بے سامانیِ فرعون توام ہے		جسے تو بندگی کہتا ہے دعوی ہے خدائی کا

له حاشیے پر "معروف" کی جگہ "معزول" لکھا ہے۔

اسیرِ بے زباں ہوں کاشکے صیادِ بے پروا — بہ دامِ جوہرِ آئینہ ہو جائے شکار اپنا

مگر ہو مانعِ دامن کشی ذوقِ خود آرائی — ہوا ہے نقش بندِ آئینہ سنگِ مزار اپنا

دریغ اے ناتوانی ورنہ ہم ضبط آشنایاں نے — طلسمِ رنگ میں باندھا تھا عہدِ استوار اپنا

اگر آسودگی ہے مدعائے رنجِ بیتابی — نثارِ گردشِ پیمانۂ مے روزگار اپنا

م

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

م

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا — حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

رہِ خوابیدہ تھی گردن کشِ یک درس آگاہی — زمیں کو سیلیٔ استاد ہے نقشِ قدم میرا

م

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے — کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

سراغِ آوارۂ عرضِ دو عالم شورِ محشر ہوں — پر افشاں ہے غبار آں سوئے صحرائے عدم میرا

نہ ہو وحشت کشِ درسِ سرابِ سطرِ آگاہی — میں گردِ[لے] راہ ہوں بے مدعا ہے پیچ و خم میرا

ہوائے صبح یک عالم گریباں چاکیٔ گل ہے — دہاں زخم پیدا کر اگر کھاتا ہے غم میرا

اسد وحشت پرستِ گوشۂ تنہائیٔ دل ہے
برنگِ موجِ مے خمیازۂ ساغر ہے رم میرا

لے حاشیے پر "میں گردِ راہ ہوں" کی بجائے "وہ غبارِ راہ ہوں" بنایا ہے۔

مطلع

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پرشور بیخوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

قلمی

نہ بھولا اضطرابِ دم شماری انتظار اپنا
کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

زبس آتش نے فصلِ رنگ میں رنگِ دگر پایا
چراغِ گل سے ڈھونڈے ہے چمن میں شمعِ خار اپنا

شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیری دل بیتاب تھا
شوخیِ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا

گرمیِ برقِ تپش سے زہرہ دل آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

م
واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریے سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

م
واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک سے تارِ نظر نایاب تھا

لے زمیں سے آسماں تک فرشِ تھیں بیتابیاں
شوخیِ بارش سے مہ فوارۂ سیلاب تھا

م
واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

دیکھتے تھے ہم بچشمِ خود وہ طوفانِ بلا
آسمانِ سفلہ جس میں یک کفِ سیلاب تھا

موج سے پیدا ہوئے پیراہنِ دریا میں خار
گریہ وحشت بیقرارِ جلوۂ مہتاب تھا

جوشِ تکلیفِ تماشا محشرآبادِ نگاہ
فتنۂ خوابیدہ کو آئینہ مشتِ آب تھا

بیخبر مت کہہ ہمیں بیدرد، خودبینی سے پوچھ
قلزمِ ذوقِ نظر میں آئینہ پایاب تھا

بیدلی ہائے اسدؔ افسردگی آہنگ تر
یادِ ایامے کہ ذوقِ صحبتِ احباب تھا

ل اس غزل کا مطلع اور مقطع دونوں دیوانِ غالب شائع کردہ مولانا حسرت موہانی اور دیوانِ غالب مطبوعہ مطبع نظامی بدایوں کے علاوہ غیر مروجہ اشعار کے ضمن میں درج ہیں۔ ع یہ شعر قلمی نسخے میں پہلے یوں لکھا تھا۔ جوشِ بادِ نغمہ ہائے سازِ مطرب سے ستم / ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا بعد میں اسے کاٹ کر یہ اصلاح کی گئی اور یہی شعر مشہور ہے چنانچہ مذکورہ بالا دیوانوں میں بھی یہی شعر [illegible]

حسنِ آشفتگی جلوہ سے عرضِ اعجاز		دستِ موئے پہ سرِ دعویِ باطل باندھا
تپشِ آئینہ پروازِ تمنا لائی		نامۂ شوق بہ بالِ پرِ بسمل باندھا
دیدہ تا دل ہے یک آئینہ چراغاں کس نے		خلوتِ ناز پہ پیرایۂ محفل باندھا
ناامیدی نے بتقریبِ مضامینِ خمار		کوچۂ موج کو خمیازۂ ساحل باندھا

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے **غالب**
ساز پر رشتۂ پے نغمۂ بیدل باندھا

جب بتقریبِ سفر یار نے محمل باندھا	م	تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا
ناتوانی ہے تماشائیِ عمرِ رفتہ		رنگ نے آئینہ آنکھوں کے مقابل باندھا
اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز	م	جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا
اصطلاحاتِ اسیرانِ تغافل مت پوچھ		جو گرہ آپ نہ کھولی اُسے مشکل باندھا
یاس و اُمید نے یک عربدہ میداں مانگا	م	عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا
یار نے تشنگیِ شوق کے مضموں چاہے		ہمنے دل کھولکے دریا کو بھی ساحل باندھا
نوکِ ہر خار سے تھا بسکہ سرِ دزدیِ زخم		جوں نمد ہمنے کفِ پا پہ اسد دل باندھا

نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں **غالب**
گرچہ دل کھولکے دریا کو بھی ساحل باندھا

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا	م	یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں	م	وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی	م	گر نفس جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا
ہوئی ہے رقمِ حیرتِ خطِ رخِ یار		صفحہ آئینہ ہوا۔ آئینہ طوطی نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی۔ کہ کبھی	م	گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے	م	ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں۔ سو وہ بھی نہ ہوا
وسعتِ رحمتِ حق دیکھ۔ کہ بخشا جاوے		مجھ سا کافر کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا
مر گیا صدمۂ آوازۂ قُم سے۔ غالب		
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب	م	ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسی نہ ہوا

شبِ اختر قدحِ عیش نے محمل باندھا		بارِ یک قافلۂ آبلہ منزل باندھا
سبحہ واماندگیِ شوق و تماشا منظور		جادہ پر زیورِ صد آئینہ منزل باندھا
ضبطِ گریہ گہرِ آبلہ لایا آخر		پائے صد موج بطوفانکدۂ دل باندھا
حیف[لہ] اے ننگِ تمنا کہ پئے عرضِ حیا		یک عرق آئینہ بر جبہۂ سائل باندھا

لہ پہلے یہ مصرع یوں تھا: "داغ اے حاجتِ بے درد کہ در عرضِ حیا" پھر اُسے کاٹ کر اس صورت میں تبدیل کر دیا ہے -

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب	م	تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا
کچھ کھٹکتا تھا مرے سینہ میں لیکن آخر		جس کو دل کہتے تھے سو تیر کا پیکاں نکلا
کس قدر خاک ہوا ہے دلِ مجنوں یارب		نقشِ ہر ذرہ سویدائے بیاباں نکلا
دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب	م	آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا۔ سو طوفاں نکلا

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا	مطلع	قیس تصویر کے پردہ سے بھی عریاں نکلا
دل حسرت زدہ تھا۔ مائدۂ لذتِ درد	م	کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا
شورِ رسوائیِ دل دیکھ۔ کہ یک نالۂ شوق		لاکھ پردہ میں چھپا۔ پھر وہی عریاں نکلا
شوخیِ رنگِ حنا۔ خونِ وفا سے کب تک		آخر اے عہد شکن! تو بھی پشیماں نکلا
جوہرِ ایجادِ خطِ سبز ہے خود بینیِ حسن		جو نہ دیکھا تھا۔ سو آئینہ میں پنہاں نکلا
تھی نوآموزِ فنا ہمتِ دشواریِ شوق تھی نوآموزِ فنا۔ ہمتِ دشوار پسند		سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

میں بھی معذورِ جنوں ہوں اسدؔ اے خانہ خراب
پیشوا لینے مجھے۔ گھر سے بیاباں نکلا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہوا	م	ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہوا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا	م	درد کی دوا پائی۔ دردِ بے دوا پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے۔ آج ہم نے اپنا دل		خوں کیا ہوا دیکھا۔ گم کیا ہوا پایا
فکرِ نالہ میں گویا۔ حلقہ ہوں زسرتاپا		عضو عضو جوں زنجیر۔ یکدلِ صدا پایا
حالِ دل نہیں معلوم۔ لیکن اسقدر یعنی	م	ہم نے بارہا ڈھونڈا۔ تم نے بارہا پایا
شب نظارہ پرور تھا۔ خواب میں خیال اُسکا		صبح موجۂ گل کو نقش[1] بوریا پایا
جس قدر جگر خوں ہو۔ کوچہ دادنِ دل ہے		زخمِ تیغِ قاتل کو۔ طرفہ دلکشا پایا
ہے مکیں کی پاداری۔ نامِ صاحبِ خانہ		ہم سے تیرے کوچہ نے نقشِ مدعا پایا
دوستدارِ دشمن ہے۔ اعتمادِ دل معلوم	م	آہ بے اثر دیکھی۔ نالہ نارسا پایا

اے اسد جفاسائی نے ستم جوں مائل
تجکو جس قدر ڈھونڈا الفت آزما پایا

نگارخانہ سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا	قلمی	میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا
ساغرِ جلوہ سرشار ہے ہر ذرۂ خاک		شوقِ دیدار بلا آئنہ ساماں نکلا
عشرت ایجاد۔ چو بوے گل و دودِ چراغ		
بوئے گل۔ نالۂ دل۔ دودِ چراغِ محفل	م	جو تری بزم سے نکلا۔ سو پریشاں نکلا

[1] متن میں "توقف" لکھا ہوا ہے۔ اسے کاٹ کر حاشیے پر "نقش" بنایا ہے۔

[2] متن میں اوپر کا مصرع درج ہے لیکن اسپر تقطیع ہے اور اس کی بجائے نیچے کا مصرع [illegible]

گردش محیطِ ظلم رہا جس قدر فلک
میں پائمالِ غمزۂ چشم کبود تھا

پوچھا تھا گرچہ یار نے احوالِ دل۔ مگر
کس کو دماغِ منتِ گفت و شنود تھا

م ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

م لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا۔ اور۔ بود تھا

خور شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسد
سرتاقدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا

م کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے۔ ہم نے مدعا پایا

م شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک باندھا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے۔ تم نے کیا مزا پایا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

بے دماغِ خجلت ہوں۔ رشکِ امتحاں تاکے
ایک بیکسی۔ تجھ کو عالم آشنا پایا

م سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

خاکبازیِ اُمید۔ کارخانۂ طفلی
یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا

کیوں نہ وحشتِ غالب باج خواہِ تسکیں ہو
کشتۂ تغافل کو خصمِ خوں بہا پایا

عہ سوادِ چشمِ بسمل انتخابِ نقطہ آرائی
خرامِ نازِ بے پروائیِ قاتل پسند آیا

اسدؔ ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہارِ ایجادیِ بیدل پسند آیا

قلمی

عالم جہاں بعرضِ بساطِ وجود تھا
جوں صبح چاکِ جیب مجھے تار و پود تھا

جز قیس اور کو نہ ملا عرصۂ طپش
جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

آشفتگی نے نقش سویدا کیا ہے عرض
آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
مژگاں جو وا ہوئی۔ نہ زیاں تھا۔ نہ سود تھا
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا۔ نہ سود تھا

بازی خورِ فریب ہے اہلِ نظر کا ذوق
ہنگامہ گرم حیرتِ بود و نبود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

تنگی رفیقِ رہ تھی۔ عدم یا وجود تھا
میرا سفر بطالعِ چشمِ حسود تھا

تو یک جہاں قماشِ ہوس جمع کر کہ میں
حیرت متاعِ عالمِ نقصان و سود تھا

عہ متن میں اس شعر پر لا۔ لا۔ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے اسے قابلِ حذف قرار دیا ہے۔ اور اس کے بجائے حاشیہ پر یہ شعر بڑھایا گیا ہے:۔

روانی ہائے موجِ خونِ بسمل سے ٹپکتا ہے
کہ لطفِ بے تحاشا رفتنِ قاتل پسند آیا

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

قمی جنوں گرمِ انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا
سویدا تا بلب زنجیرے دودِ سپند آیا

مہ[لہ] اختر فشاں کی بہرِ استقبال آنکھوں سے
تماشہ کشورِ آئینہ میں آئینہ بند آیا

تغافل بدگمانی بلکہ میری سخت جانی سے
نگاہِ بے حجابِ ناز کو بیمِ گزند آیا

فضائے خندۂ گل تنگ و ذوقِ عیش بے پروا
فراغت گاہِ آغوشِ وداعِ دل پسند آیا

عدم ہے خیر خواہِ جلوہ کو زندانِ بیتابی
خرامِ ناز برقِ خرمنِ سعیِ پسند آیا

م جراحت تحفہ۔ الماس۔ ارمغاں نادیدنی دعوت
جراحت تحفہ الماس ارمغاں۔ خونِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

نم شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

م بفیضِ بیدلی نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

م حجابِ سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

ہوئی جس کو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی
برنگِ لالہ جامِ بادہ بر محمل پسند آیا

لہ پہلے یہ مصرع متن میں یوں تھا: بہ استقبالِ تمثالِ زماں اختر فشاں شوخی۔ پھر اسے شکلِ بالا بدل دیا۔

دِیوانِ غالب جدید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ردیف ا

(۱)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا | م | کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
آتشیں پا ہوں۔ گدازِ وحشتِ زنداں نہ پوچھ | | موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا
شوخیِ نیرنگ صیدِ وحشتِ طاؤس ہے | | دام سبزہ میں ہے پروازِ چمن تسخیر کا
لذتِ ایجادِ ناز افسونِ عرضِ ذوقِ قتل | | نعل آتش میں ہے۔ تیغِ یار سے نخچیر کا
کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ | م | صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
خشت پشتِ دستِ عجز و قالب آغوشِ وداع | | پُر ہوا ہے سیل سے پیمانہ کس تعمیر کا
وحشتِ خوابِ عدم شورِ تماشا ہے اسد | | جو مژہ جوہر نہیں آئینۂ تعبیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے | مطلع | سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے | | مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

کیفیت کی لاعلمی جاتی رہی ہے ضرور کم ہوگی۔ فارسی قصہ نگار نے اگر وگل کی داستان میں اور فرانسیسی داستان گو نے Mademisellede maupin میں اسی امر کو بیان کیا ہے

گر ترے جی میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

اس عشق کے اہل اہل ولا کی طرح ہر زمانے میں شاذ ہی ہوتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں۔

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی میں صلا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

یہ انتظار غیب و حضور دونوں میں یکساں رہتا ہے خود نظارۂ رخِ یار کا پردہ بن جاتا ہے۔

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

یہاں تک کہ وہ معشوق اگر صبائے محبت میں قبائے حریر کے بند خود کھول دیتا ہے تو بھی "ز شادی دست و پا گم می شود خود را نمی یابم"

میں نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازتِ تسلیم و ہوش ہے

اس مدام لب دریا تشنہ لبی کا باعث صرف یہ ہے کہ علوی محبت کبھی جسمانی قرب سے خود کو سیراب نہیں کرتی اگر معشوق کے دستِ نازنین کو کہ بوسہ دیا جائے تو دوسرے بوسے میں یا تو پہلے کے مساوی لذت ہوگی یا اس وجہ سے کہ پہلا بوسہ لینے سے معشوق کی نارسائی کی شان جاتی رہی ہے اور اگر مساوی ہے تو بھی چونکہ پہلے بوسے جو سکی

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل　　جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

جو اہلِ ہوا و ہوس ہیں کوچۂ عشاق میں قدم رکھتے ہیں وہ اہلِ دل کو بدنام کرتے ہیں

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اس عشقِ حقیقی میں ایک کیف دوامی ایک خمار ابدی ہے ہمیشہ آرزوئے وصل رہتی ہے کبھی پوری نہیں ہوتی اس کا لطف جو جانکنی سے زیادہ لطف بخش ہے کبھی کم نہیں ہوتا "وصالِ یار" وہیں ہے جہاں آرزوئے خام ہے اور اسیر آرزو ہے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

یہاں تک کہ عاشق سراپا ایک "شعلۂ مضطر" بن جاتا ہے۔

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

جہاں اس کا حسنِ حقیقی بے پایاں وہیں اس کی تابِ عاشقی بے نہایت ہے

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر　　جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر　　دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ذات حرص سے پاک ہے۔ ان کو اس کے حسن بے پایاں کے دیکھنے سے ایک ارتعاش روحانی اور ایک جدائی سی پیدا ہوتا ہے جس میں جذبات کامرانی اور خواہشات کا کوئی شائبہ نہیں اس کا جلوۂ رخ ایک کیفیت وجدانہ پیدا کر دیتا ہے اور جسم کے تار تار میں ایک رقص عشقیہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ حالت آرزوئے بشریہ سے لاتعلق ہوتی ہے۔ ہوس غلبہ کیا ہے جب وہ گیرائی اور قبضہ کی جانب مائل ہوتی ہے تو یہ ہوس پیدا ہوتی ہے۔ ہوس مطلوب کو اپنے پرشہوت ہاتھوں سے ملوث کرنا چاہتی ہے۔

عشق کیا ہے۔ عشق میں ادب اور شرم شامل ہیں عشق دوسرے پرستش اور پرستاری کی تا ہے جہاں اضطراب آتش زیر پائی خوف ہے وہاں عشق نہیں عشق نور ہے اور جلوت خلوت دونوں کو اپنی ضیاء سے روشن کرتا ہے۔

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

میدان عشق میں جہاں جانا بازیٔ طفلاں نہیں ہے ہزاروں میں سے ایک عزت سلامت لاتا ہے اسی عشق کا درجہ ہے۔

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو گا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

جہاں درد سو جو د ہو عشق ضرور ثمر لاتا ہے۔

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجر بید نہیں

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

اور عشق کا ثمر خانہ ویرانی، بربادی تباہی پشیمانی، بے اعتباری، عریانی اور صحرا نوردی ہے۔

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا
ہوئے گل نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دل بدل پیوستہ گویا اک کفِ افسوس تھا

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

گوش مہجورِ پیام چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

لیکن گو مرزا غالب کی معشوقہ ایک عارضی عورت ہے۔ ان کا عشق ہوس مطلبیہ

لیکن دل سے دماغ مجبور ہے۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہو

عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

یہ وحشت طبیعت میں ازل سے راسخ ہے اور یہ سکون و راحت کے مانع آتی ہے

دلگی کی آرزو بےچین رکھتی ہے ہمیں

ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

یہ وہ مرض ہے طبیعت جس کے علاج سے منحرف رہتی ہے اور ہمیشہ چاہتی ہے

کہ کبھی صحت نہ ہو فیضی کا شعر ہے

نوشداروئے محبت رامپرس اجزا کہ صبیت

سودۂ الماس در زہرِ ہلاہل میکنند

مرزا غالب اسی شعر کو جلا دیکر فرماتے ہیں۔

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا

کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

اس عشق جوئی کا سبب یہ ہے کہ اسی ہنگامہ ہائے وہو سے عالم میں رونق ہو جاتی ہے

رونق ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے　　انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

نرگس کی طرح تاب نہ لا سکے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لیکے رہ گئے

صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

عشق کیا ہے؟ آرزوئے وصل جو دو پریشان خاک کے ذرّوں اور دو پریشان دلوں میں یکساں موجود ہے۔ کن اسباب سے پیدا ہوتی ہے مادہ کی کشش اور دل کی کشش دونوں ایک ہیں کشش کا تقاضا ہے کہ ایک دوسرے کو قریب کرے گو کشش کے نیو لا اجسام جو جتنے قریب ہوتے ہیں کشش میں افزونی ہوتی ہے۔ یہی محبت کی کشش کا حال ہے عشق میں کہیں ایک جانب فاتحانہ غلبہ اور دوسری جانب مفتوحانہ تسلیم کہیں دونوں سمت جوش جذبات اور آرزوئے قرب، کہیں ایک طرف جویائی اور دوسری طرف گریز پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ کشش قلبی کب اور کہاں اور کیوں پیدا ہوتی ہے اس کا نشان پانا مشکل ہے۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب

کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

فلسفی، ذہنی، اور دماغی نکتۂ نظر سے عشق کو مرض قرار دیتے ہیں۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ　　چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو　　زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

اس کا معشوق تمام عشوہ گری کے انداز اور ناز سے واقف ہے۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا،

لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے،

اُس کے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری

حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

اس کا حسن انتہائے جمال ہے ورنہ مرزا جیسے بلند نظر کی نگاہ میں سما بھی نہیں سکتا یہ وہ حسن ہے جو نہ صرف مرعوب بلکہ مغلوب کر لیتا ہے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم

میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی　　خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

یہاں تک کہ وہ اگر خود اپنے حسن کو چشمِ آئینہ میں دیکھ لے تو یونانی نوجوان

ہوکر بھی نہیں دیکھ سکتے جب اور کوئی مانع نہیں ہوتا تو نگاہ خود مانع آتی ہے اور پردہ بن کر حائل ہو جاتی ہے۔

ہنوز محرمِ حسن کو ترستا ہوں کرے ہے ہر بنِ مو کام چشمِ بینا کا

واکر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن

غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

اس یوسف کے عشق میں ایک عالم زنِ عزیز کی مثال دیوانہ ہے لیکن اس کا جامۂ پیرہن اس کی پارسائی کے منہ پر مہر ہے۔

نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بیوفائی کا

بہ مُہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

مرزا غالب اُن شعرا میں سے ہیں جو حسن کو نیرنگِ قدرت یا کیف مینا یا منظر کے میں تلاش نہیں کرتے بلکہ عورت کے سینہ میں ڈھونڈتے ہیں۔

مرزا غالب کی معشوقہ مریم نہیں جو خیال غیر سے پاک اور جنس مقابل سے بالاتر ہے بلکہ زلیخا ہے وہ خود یوسف نہیں بلکہ سری کشِ اُن کے معشوق کی تصویر رافیل (Raphael) نہیں کھینچ سکتا یہ روبنس (Rubens) کا کام ہے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

سر مہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

استغنا اور غرور اُس کو رو نمائی تک میں مانع آتے ہیں اور وہ اپنے چہرہ نازنین سے نقاب نہیں اُٹھاتا۔

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ یوں ہیں حجاب میں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

وہ اپنی آپ مثال ہے، کوئی اُس کی مثال نہیں۔

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بت آئینہ سیما نہ ہوا

ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کو آگے پرافشاں جوہر آئینہ مثل ذرہ روزن میں

جس آئینۂ جہاں نما میں وہ پرتو فگن ہو جاتا ہے، طوطی جوہر کی حالت مرغ قبلہ نما کی سی ہو جاتی ہے۔

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیٔ ناز
جوہر آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا

جو مجذوب عشاق سب دیکراس کو لے لیتے ہیں وہ بھی اُس کا روئے انور سرایا نگہ

آہ تا دمِ آخر کیا آرزوئے بیخودی ہے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مادہ خود بے صورت ہے مادہ میں نہ کوئی خوش صورتی ہے اور نہ بدصورتی ہے حسن خارج نہیں باطن ہے۔ حسن مادہ کے جسم میں نہیں بلکہ صاحب نظر کی نگاہ میں ہے حسن ہیئت کا قلب شعلہ ہے مادہ صرف پردہ فانوس ہے شاعر جو حسن کو دیکھکر محو تماشا ہو جاتا ہے اور اپنی ذات کو خوبصورتی میں فنا کر دیتا ہے، یہ کیا ہے؟ عدم اور ازل میں جو صورت دیکھی ہے وہ شرار کے تبسم کی مثال نظر آتی ہے اور منہ چھپا لیتی ہے۔ نہال ثمرور یا عشق پیچاں میں، پھولوں میں یا عطر میں، عورت میں خواہ دوشیزہ ہو یا ناشیزہ کوئی حسن نہیں حسن اس اشارہ میں ہے جو جمال الٰہی اُن کے ذریعہ سے کرتا ہے۔ مرزا غالب کو ہر طرف جو جلوہ روئے صنم نظر آتا ہے وہ "رخ لیلیٰ نہیں بلکہ "عارض جانِ عالم" ہے یہاں تک کہ جب ہر آنکھ اُس کی دید کی تمنا رکھتی ہے۔

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے

جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

لیکن وہ معشوق حقیقی اپنے وصل سے کسی کو خوش کام نہیں کرتا۔ بلکہ شرم و

انی کا ظرف ہے کہ اس دانش ربا شراب کو جس کی دوسرے بو بھی نہ لے سکتے پیتے ہیں یہ وہ شراب ہے کہ جب ساقی جام میں ڈالتا ہے تو مسیح، و خضر رشک سے سبقت کیلئے کشاکش کرتے ہیں یہ شراب غم شکن اور شادی اثر ہے۔

بہت سی غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے

بہشت کی آرزو بھی یہی ہے کہ ایک ہاتھ میں زلف یار ہو اور ایک میں یہ شراب ہو۔

وہ چیز جس کے لئے ہو ہمیں بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

اس شراب کے پینے سے تمام حقائق روشن ہو جاتے ہیں اور تمام قیود سے نجات ملجاتی ہے اور دل کا غنچۂ بستہ کھل کر پھول ہو جاتا ہے۔

تشۂ رنگ سے ہے واشد گل
مست کب بند قبا باندھتے ہیں

وہ کیسے خوش قسمت ہیں جن کو یہ دولت قسمت ہے۔

جانفزا ہے بادہ جسکے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مرزا کی شراب سے بیخودی مراد ہے۔ یہ وہ کیفیت جذب ہے کہ جہاں سالک راہ طریقت پر فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے باادب اور خاموش جا رہے ہیں سر راہ بیٹھے اللہ ہو کے نعرے لگا رہے ہیں

چوں عمر تبہ کردم چنداں کہ نگہ کردم
در کنج خرابات افتادہ خراب اولے

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
درد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرق جنون و تمکیں

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوف حرم سے
آلودہ مے جامۂ احرام بہت ہے

یہ سرمستی اور مدہوشی کم مائگی نہیں ہے بلکہ مخانۂ جاوید میں داخل ہو کر شراب بے اندازہ پی گئے ہیں۔ یہ کیف سرمدی ہے۔ یہ عشق الٰہی کے نشہ میں غرق ہیں۔ کون ایسا ہے جو اس کیف میں سرشار ہو کر ہوشمند رہ سکتا ہے۔

حریف جوشش دریا نہیں خودداری ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ

آخر تو کیا ہے اے "نہیں ہے"

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے

لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

(۱۷)

جب عمر خیام کی شیرازی شراب کو فٹز جیرالڈ (Fitz Gerald) نے ایران سے مغرب میں محفل فرنگ میں پیش کیا تو سب نے یہ سوال کیا کہ یہ مینائے معرفت ہے یا بادۂ مجاز۔ مغربی عمر خیام کے کلام میں ابیقورس کے فلسفۂ ابتہاج کی شوخی اور بےباکی پاتے ہیں، اور خیام کی تلقین لذات و شہوات سے متمتع ہونے اور دنیاوی لذائذ کے ذریعے نفس کو تسکین دینے میں خیال کرتے ہیں۔

اگر غالبؔ کا انگریزی، المانی، فرانسہ، یا روسی زبان میں ترجمہ ممکن ہو اور کیا جائے تو عجب نہیں کہ یہی سوال غالبؔ کے متعلق پیدا ہو لیکن مرزا کی شراب کے طہور ثابت کرنے کے لئے کسی علم البیان کے رسالہ کی مدد ضروری نہیں بلکہ خود ان کا بیان موجود ہے

مطلب ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام

چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

بادشاہ۔ اور.....

مغنی تیقّن سے جو ایمان کے درجہ تک ہو اور شک سے.....

بادشاہ شک سے بھی۔

مغنی۔ جو ایمان کے درجہ تک ہو ناقص نہ ہو۔

بادشاہ ناقص شک کس کو کہتے ہیں۔

مغنی۔ جہاں پناہ جس میں شک کرنے والے کو خود اپنے شک میں شبہ ہو۔ یہ شفق ہے۔ جو نور اور ظلمت دن اور رات دونوں سے محروم رکھتی ہے۔

مرزا غالب اپنے شکوک میں کامل ہیں چنانچہ دریافت کرتے ہیں۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع — گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف

آج سینے میں مرے درد سوا ہوتا ہے

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا   وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

بیان۔ خیال یہ ہے کہ لفظ غالب میں ابہام ہے لیکن یہ خوشگانی ہے اور

عیب جو کا اپنا آپ قصور ہے۔

(۱۶)

ملک ناروے (Norway) کا مشہور ادیب ہنرک ابسن

(Henrik Ibson) اپنے ناٹک (Kongs Emmerre) وارثان تخت

میں بادشاہ اور مغنی کے درمیان حسب ذیل گفتگو لکھتا ہے۔

بادشاہ تم کس طرح مغنی ہو گئے تم نے فن موسیقی کس سے حاصل کیا؟

مغنی۔ جہاں پناہ، فن موسیقی تحصیل نہیں ہو سکتا۔

بادشاہ۔ نہیں!

مغنی۔ نہیں میں نے یہ خداداد اکرام غم کے ہاتھوں پایا ہے۔

بادشاہ۔ تو کیا مغنی ہونے کے لئے غم کی ضرورت ہے۔

مغنی مجھکو غم سے یہ دولت ملی بعض کو مسرت سے یہ نعمت حاصل ہوتی ہے اور.....

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یوں

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی — بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

صحبت میں غیر کے نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے — ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا جو میری شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

انھیں وجوہ سے مرزا نے کبھی کسی کی ہجو نہیں لکھی ایک شعر کی نسبت جو شہزادہ جواں بخت کے سہرہ کا مقطع ہے یہ کہا گیا تھا کہ ذوق پر حملہ ہے لیکن مرزا قطعہ گذارش میں کہتے ہیں کہ مقطع میں محض سخن گسترانہ بات آپڑی ہے، اور کمال فراخ دلی سے اس قصور کے لئے بھی معافی کے طالب ہیں۔ آزردن دوستاں جہالت است۔

دو ایک اشعار کی نسبت گمان ہو سکتا ہے کہ ذوق پر جن سے چشمک ضرور بھی تھی

میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم "ذوق" فزا ہوتا ہے

مرزا یوں فرماتے ہیں۔

عرض نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے
دعوئے جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام
ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

لیکن مرزا گو کبھی بلند آواز سے نہیں ہنستے گاہ گاہ زیرِ لب تبسم ضرور کرتے ہیں ان کا تبسم تمسخر نہیں بلکہ جز لاح (Espiril) کا انداز رکھتا ہے یہ ابتسام شوق کے کسی خلاف عادت کام سے یا اپنے کسی خلاف عادت ارادہ سے یا کسی خلاف عادت واقعہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کسی کی بابت کسی کے متعلق حملہ یا اشارہ عیاں یا پنہاں نہیں ہوتا بلکہ بقول وکٹر ہیوگو Victor-Hugo اس کا منشاء Pour rien, pour be plasir ہوتا ہے۔

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

کی خارجی کیفیات سے اندرونی جذبات کا اندازہ نہیں کرتے بلکہ اپنے اندرونی جذبات سے خارجی کیفیات کا موازنہ کرتے ہیں اس لئے غالب کے لب ہنسی سے ناآشنا ہیں۔

خندہ غم سے ناواقف ہونے کی اور لطف خواب کی علامت ہے۔ اطفال شیر خوار سوتے میں ہنستے ہیں لیکن جب بیدار ہوتے ہیں تو روتے ہیں جب تک انسان آلام مصائب سے شناسا نہیں ہوتا ہنستا رہتا ہے لیکن جب دل ٹوٹ جاتا ہے تو بجز غم کے کوئی رفیق نہیں رہتا۔ بد نصیب مرزا سے قہقہۂ نشاط کی امید رکھنا بے جا توقع ہے۔

خندہ غم اور سکون کو چھپانے کا پردہ بھی ہے، اس مسئلہ پر برگسان اور غالب متفق ہیں برگسان اپنی کتاب خندہ کے اختتام پر لکھتا ہے۔

"سمندر میں سطح پر موجوں میں رقص اور ارتعاش پایا جاتا ہے لیکن عمق قلزم میں ہمیشہ امن و سکون ہوتا ہے بالائے آب لہریں آپس میں ٹکراتی ہیں اور کف لے آتی ہیں بچے کف دریا کو خوش ہو کر ساحل سے اٹھا لیتے ہیں لیکن جب ہاتھ کھول کر دیکھتے ہیں تو بجز پانی کے کچھ بھی نہیں پاتے۔

قہقہہ زندگی کے سمندر کا کف ہے جو شخص اس کے رقص کو فاصلے سے دیکھتا ہے خوش ہوتا ہے اور آفتاب سے اس کا آبدار جسم روشن ہو کر طلسم نور نظر آتا ہے لیکن جو قریب جاتا ہے محض فریب پاتا ہے اور تلخ کام ہوتا ہے۔"

میرے ڈتھ MEREDITH اور برگسان BERGSON نے اس پر تفصیل سے
بحث کی ہے۔ اور عجیب اور نادر نکات پیدا کئے ہیں قہقہہ ہمیشہ مجلسوں میں بلند
ہوتا ہے، جہاں گرم صحبت نہیں یہ ساز محفل بھی نہیں اسی وجہ سے لکھنؤ کے قیصر
باغ کے عیاشانہ جلسوں کے رند، انشا، اور جرات اور آگرہ کے برج کی ہولیوں
کے کنہیا نظیر کے قہقہوں کی آواز آج تک بلند ہے اور میر تقی، میر درد اور
غالب کے کلام میں جو دنیا سے نفور اور ہنگامہ عالم سے دور رہنے والوں میں
ہیں کمال سنجیدگی اور خاموشی کا اثر ہے قہقہہ ! قدرت کا غلبۂ نفس دور کرنے کا
ذریعہ ہے، یہ صحت بخش ضرور ہے لیکن خود اخلاط کی زیادتی اور مرض کی علامت
ہے۔ چنانچہ رنگین اور دیگر ہزل سرا شعرا کا اصلی علاج بذریعہ فصد ہونا چاہئے
تھا مرزا کی طبیعت میں خیالات سفیہہ کو بالکل بار نہیں۔ خندہ اصلاح عیوب
کے لئے ایک تازیانہ ہے اس میں انصاف نہیں بلکہ ایک ظلم پایا جاتا ہے۔
سودا اور اکبر کے قہقہوں کی یہی شان ہے۔ غالب کی طبیعت میں رحم ہے
وہ انسانی کمزوریوں پر لب آسا ہنستے نہیں بلکہ چشم آسا روتے ہیں بلکہ خندہ
لاتعلقی کی علامت ہے زندگی کو جو شخص دور سے دیکھتا ہے اور خود بے پروا رہتا ہے
وہ ہنستا ہے اور جو قریب سے دیکھتا ہے اور اُس میں شریک ہوتا ہے وہ نہیں ہنستا غالب زندگی

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

موت کے بعد جسم محض کالبد ایک نشان رفتگان سے زیادہ نہیں، روح کا چلا جانا اصل واقعہ ہے جسم کا رہ جانا اس سے زیادہ نہیں کہ جیسے گل کی پریشان پنکھڑیاں خشک ہو کر گر پڑتی ہیں جس طرح صبا گلاب کی پتیوں کو اُڑا کر ڈھیریاں لگا دیتی ہے اور کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ اس جسم کو بھی ہونا چاہیے اس کو مضبوط اور قیمتی صندوقوں میں سجانے آگ کے مقدس شعلوں کی نظر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ شراب ساز کو دیدیا جائے کہ وہ اسے بادہ میں آغشتہ کر کے اس سے پھر جام تیار کرے، یا گلیوں میں تشہیر کیا جائے تاکہ ایک آخری کام اس سے بھی سرانجام ہو

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

خندہ کیا ہے؟ ارسطو کے زمانہ سے آج تک فلسفی اس مسئلہ پر غور کرتے آئے ہیں ہمارے زمانے میں کانٹ KANT، سپنسر SPENCER، ہیکر HECKER کریپ لین KRAEPLIN بین BAIN لپس LIPPS

دلاتی ہے اور عذاب روحانی سے آزاد کرتی ہے باغ عالم میں افراد اثمار کی مثال ہیں۔ بہت سے ترش ہوتے ہیں جن کو تا ختم بہار پختہ ہونے کے لئے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بعض شیرینی کو پا ہی نہیں سکتے، اور محض بزدلی کے باعث اپنی شاخوں کو خیر باد نہیں کہتے بعض اپنی گراں باری سے شاخوں کو توڑ دیتے ہیں بعضوں کو ہوائے تند خراب کر دیتی ہے بعض کو خار یا طائر رات کو کھا جاتے ہیں، بعض کے قلب میں دیدان گھر بنا لیتے ہیں۔ بعض کا رنگ خوبصورت ہوتا ہے لیکن حلاوت سے عاری ہوتے ہیں بعض گو خوشبو رکھتے ہیں ذائقہ اُن کا تلخ کام کرتا ہے بہت سے بچے ضعیف پیدا ہوتے ہیں، بہت سے ضعیف تا دم گور بچے ہی رہتے ہیں، بعض جوانی میں سر سفید ہو جاتے ہیں بعض پیری میں بھی سر سیاہ و دندان سفید رہتے ہیں۔ لیکن موت کے آرام کی سب کو ضرورت ہوتی ہے۔

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

سپاہی اپنی موت تلوار سے چاہتے ہیں۔ منجم بھیلے سے اپنے آخری وقت سے مطلع ہونا چاہتے ہیں، شعراء فصل بہار میں غنچہ ریز مولسریوں میں دب کر مدفون ہونا پسند کرتے ہیں لیکن یہ سب خامی ہے جو اہلِ ظرف ہیں اِن قیود کے قائل نہیں۔

لیکن موت بھاری نہیں۔ موت سے زیادہ سہل اور کوئی چیز نہیں۔

ہے نوآموز فنا ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

موت سے انسان کے گھبرانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کو یہ خوف دامن گیر ہوتا ہے کہ کہیں اختتام۔ زندگی چراغ شخصیت کو ہمیشہ کے لئے گل نہ کردے لیکن جیسا کہ ماٹرلنک MAETERLINCR نے بیان کیا ہے۔ ہستی محض یادوں کا مجموعہ ہے جو چیز ہمیں تمام علاوہ سے ایک عارضی امتیاز دے رہی ہے، وہ چند یادوں کے اجزائے پریشان ہیں اور یہ عارضی امتیاز ایسا عارضی ہے کہ "نشہ سے"، عالم خواب، جنون، صدمات، عارضی، رویا تک میں قائم نہیں رہتا یا منقلب ہوجاتا ہے۔ مرزا غالب اس خوف سے مبتلا نہیں ہیں بلکہ ان کی سکون طلب طبیعت کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں احیاء بعد الموت بھی ایک تنازع البقا اور کون وفساد ہی نہ ہو

وائے واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا ... لے گیا تھا گور میں ذوق تن آسانی مجھے

موت سے زیادہ گوارا کوئی نیند نہیں ہے۔ سکرات اور نزع تو زندگی کا جانا ہے موت کا آنا نہیں۔ موت تو تمام تکالیف ارضی کو ختم کر دیتی ہے، آلام جسمانی سے نجات

جدا خیال کرنے لگتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ میں دنیا میں اجنبی ہوں اور مخالف اشخاص اور قوانین سے گھرا ہوں لیکن انسان اور علاوہ میں حقیقت میں کوئی رخنہ حائل نہیں ہے یہاں تک کہ موت بھی کوئی اس میں کوئی رخنہ پیدا نہیں کرتی اپنشدوں میں لکھا ہے "موت اور بقا اس کا سایہ ہے موت اور حیات میں کوئی فرق نہیں نہ تضاد ہے بلکہ حیات ہی موت ہے۔ حیات کی آمد زندگی اور رفت موت ہے۔ موت حیات عارضی کو دائمی کر دیتی ہے۔

فنا کو سونپ اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا　　فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

عشرتِ قتل گہ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

نظر میں ہے ہمارے جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

مرزا غالب موت کے مقابل میں خائف بچہ کی مثال نہیں ہیں وہ اُن میں نہیں ہیں جو جس قدر موت کے خیال سے خالی الذہن ہونا چاہتے ہیں اتنا ہی خیال مرگ اُن کو ستاتا ہے۔ موت کا خوف خوف کرنے سے بڑھتا ہے۔ موت کو خواہ مخواہ سخت بنا رکھا ہے۔

وہ کانپتی ہے جیسے موت کے فیصلہ کن ضرب پر شدتِ درد میں زندگی کا آخری جواب وہ چمکتی ہے جیسے ایک خوفناک چمک کے ساتھ دنیاوی حس کا جلا دینے والا پاک شعلۂ ہستی۔

خوبصورت ہے تاروں جیسے جواہرات سے مزین تیرا کنگن۔ لیکن تیری تلوار کی ساخت میں، اے گرج کے مالک، کمالِ حسن صرف ہوا ہے۔ جو بصارت و تخلیل (دونوں) کے نزدیک مہیب ہے"۔

یہی باعث ہے کہ مرزا غالب نے افلاطون کے استاد سقراط کی مثال تلخ زہرِ آب کو ہمیشہ نوشِ شیریں پر ترجیح دی۔ غالب کا علم الاخلاق جان سپاری ہے

ع جان سپاری شجر بید نہیں

(۱۴)

مرزا غالب اُن تابوت بردوش فلسفیوں میں نہیں ہیں جو زندگی کو ماتم خانہ، اور اہلِ دنیا کو اہلِ جنازہ خیال کرتے ہیں۔ وحدت الوجود کے فلسفہ کا پہلا سبق یہی ہے کہ ماسوا اور خدا صرف عارضی طور پر جدا ہیں اور بعد الموت یہ جدائی ختم ہو جاتی ہے

ع عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

انسان خود کو اپنی غلط بینی سے اور افراد سے علیحدہ اور اپنے ماحول سے

اتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے جتناکہ وہم غیر سے ہوں پیچ وتاب میں

جور ازِ عالم سے آگاہ ہو جاتے ہیں وہ آلام اور تکلیف نہیں پاتے اور شکایت نہیں کرتے بلکہ فلسفۂ غم فلسفۂ حیات کے ہم معنی اور مترادف ہو جاتا ہے۔

قیدِ حیات وبندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

عیش ونشاط دینا کمزوروں، اور کم ظرفوں کا حصہ ہیں۔ جو رندان آتش نوش ہیں اُن کے لئے شرابِ غم مخصوص ہے۔ جو کیفِ رنج سے معمور ہے۔

درخورِ قہر وغضب جب کوئی ہمسا نہ ہوا پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

پوچھے ہے کیا وجود وعدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس وخاشاک ہو گئے

جمالِ ایزدی غائت خوب ہے مگر جلالِ ربی جس کے ہیبت انگیز جلوہ کی نہ موسیٰ نہ طورتاب لاسکے کمالِ حسن ہے۔ ٹیگور کہتے ہیں۔

"خوبصورت ہے ستاروں سے آراستہ مختلف رنگ کے جواہرات سے جڑا ہوا تیرا کنگن۔ لیکن میرے لئے تو اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے تیری تلوار محترم طائر وشنو کے پھیلے ہوئے بازو کی طرح بجلی کا سا خم رکھنے والی تلوار غروب آفتاب کی غصہ ناک سرخ روشنی میں پوری طرح تلی ہوئی تلوار۔

نہیں پھرتے بلکہ وہ مادہ سے یکجان ہیں۔ مادہ چونکہ سافل ہے مادہ کے جزوِ حیات ہونے سے کثافت اور خرابی عالمِ اجسام میں راہ پاتی ہے۔ مادہ کے ذریعہ زوال اور انحطاط ابتدا ہی سے جزوِ بدن ہو جاتے ہیں۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

وہ شئے لطیف جو مادہ کی آمیزش سے حیات کو تکمیل دیتی ہے روح ہے۔ روح مادہ کے محبس میں اسیر ہونے سے گھبراتی ہے اور اپنی ماضی کو یاد کرتی ہے۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

لیکن یہ روح اور مادہ کا امتیاز حقیقت میں ایک فریبِ خیال ہے ورنہ مادہ محض مایا ہے جب ادراک کامل اور عقل رسا ہو جاتی ہے تو مادہ کی غیریت خود بخود زائل ہو جاتی ہے۔

انسان کی اصل مرزا کے خیال میں علت العلل سے ایک ہے۔ اور حیات اُس کا اپنے مبدء سے جدا ہو کر دنیا میں آنا ہے چنانچہ کہتے ہیں

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
(۱۴) ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

انسان کا عدم سے وجود میں آنا بحر سے قطرہ ہو جانا ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں کہ میں "نے" ہوں جس میں وہ سرود نوازِ عالم صوت سرمدی دم کرتا ہے

از نیستان چوں مرا ببریدہ اند
از نوایم مرد و زن نالیدہ اند

مرزا غالب کہتے ہیں

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

مرزا غالب کا فلسفۂ حیات ابن رشد سے مشابہ ہے اندلسی فلسفی نے بیان کیا ہے کہ مادہ ہمیشہ ہیولیٰ کا محتاج ہے۔ بے صورت مادہ کا تصور نا ممکن ہے ہیولیٰ ارواح کی طرح مادہ سے صورت آشنا ہونے کے لئے پریشان علیحدہ تصور میں

اس جادہ پیمائی کا جو سفرِ نیاز میں ہے ایک قدم تمام اس زندگی کی مسافت سے جو سفرِ نماز میں ختم ہو زیادہ ہے۔ ایسے آوارگانِ کوئے صنم کی خودرائی کا کیا کہنا ہے۔ عمر خیام کہتے ہیں کہ جب قیامت میں مجھ سے سوال ہو گا تو میں کہوں گا۔ "ایں رابہ کسے بگو تراشناسد" مرزا غالب جو دعوے رکھتے ہیں کہ

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

کیا عجب ہے کہ حضورِ داورِ محشر میں یہ عرض کریں۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

جو عبادت اس درجہ پر پہونچ جاتی ہے وہ قیدِ کفر و دین سے آزاد ہے وہ عشقِ کامل ہے

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

حقیقی بہشت قربِ الٰہی اور حقیقی جہنم بعدِ خداوندی ہے

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

اگر جنت کی ہوا و ہوس اور دوزخ کا خوف و ہراس دل پہ غالب ہو تو عبادت عین معصیت ہے یہاں تک کہ اگر طالب کو یقین ہو کہ اُس کی مناجات درجۂ قبول ضرور حاصل کرے گی تو یہ خیال ہی سجدۂ نیاز کو باطل کر دینے کے لئے کافی ہے

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

جنت و دوزخ اور امید و بیم مانع عشق حقیقی اور معرفت ایزدی ہیں۔ اللہ اکبر کس مقام پر نشستہ ہیں جہاں سے یہ فتویٰ صادر فرمایا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

اس پایہ کے لوگ جب سفر کعبہ کو نکلتے ہیں تو کعبہ خود اُن کے استقبال کو آتا ہے۔

اسماء الٰہی کا وظیفہ پڑھتے ہیں صد ہزار دانہ ہی اور وہ دانہ اجرام فلکی اور اجسام سماوی ہیں۔ کعبہ اور دیر کلیسا او کنشت اس رفیع بارگاہ سے یکساں نظر آتے ہیں جہاں عوام و خواص کا مذہب منتہی ہو جاتا ہے مرزا کا مذہب آغاز ہوتا ہے۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ذاتِ خداوندی گو جملہ مذاہب کا مقصود ہے خدا تعالیٰ خود طریق و ملت کی قید سے مبرا ہے مرزا غالب بھی کسی ارضی مذہب کے پابند نہیں بلکہ اُن کو ہر مذہب کا اس قدر پاس ہے کہ اُنھوں نے سب میں شرکت کی خاطر تمام کی ظاہری رسومات کو جو باعث امتیاز ہیں ترک کر دیا ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اُن کی طلب و آرزو دوزخ کے عذاب کے خوف اور جنت کی لذات کی حرص سے آزاد ہے

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

جنت فی الحقیقت عوام کے لئے ایک خوش آیند خیال ہے

نہ معلوم یہ خیالات مرزا غالب نے مجسطی مسعودی اور عمر خیام کے مطالعہ سے اخذ کئے یا وہ اپنا وقت دہلی کے جنتر منتر میں گذرا کرتے تھے۔ اور ہمایوں کی طرح جو ستارہ بینی میں فلک پیمائی کیا کرتے تھے۔ یا علم ریاضی کے ذریعہ اونھوں نے اس کا پتہ لگایا یا اُن کی تخئیل فضا پیما تھا کانٹ KANT لاپلس LAPLACE اور ہرشل HERSCHEL اور اُن کے جانشینوں سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ نظام ہائے فلکی کی آفرینش ایتھر سے اس طرح ہوئی ہے جس طرح کبھی خرادپر سے ٹکڑے جو گردیت میں حایل ہوتے ہیں ٹوٹ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ یا جیسے کوئی کسی چیز کو پھینکتا ہے مرزا غالب کو خورشید کی نسبت یہ کہاں سے معلوم ہوا۔

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

جس شخص کی نگاہ سے ستاروں کی آفرینش مخفی نہ تھی اس کے لئے جغرافیکی جدید تحقیقات کیا حقیقت رکھتی ہے ع

بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

مرزا غالب کی عبادت گاہ عرش و کرسی کے سایہ میں ہے۔ وہ تسبیح جس پر وہ

غنچۂ ناشگفتہ برگ عافیت معلوم
باوجود دلجمعی خواب گل پریشاں ہے اور جو عالم ارتعاش کیف اور تحریک میں دکھائی دیتا ہے وہ بھی بستۂ زنجیر کون ہے۔

کشاکش ہائے ہستی ہو کرے کیا سعی آزادی   ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

یہ کون و فساد کا نقشہ صاف بتلاتا ہے کہ کوئی صورت نگار اس پردہ کے عقب میں موجود ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

جب میں مرزا غالب کی طبیعات الہیت پر غور کرتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے یہ فلکیات کی ایک جدید ترین تحقیقات خیال کی جاتی ہے جو مشاہدہ سے زیادہ ریاضی کے تخمینوں پر مبنی ہے کہ اگر ہم فضائے سماوی کے سب سے آخری ستارے اور سیارے تک پہونچ جاتے ہیں تو وہاں سے آگے بھی ویسے ہی ستارے اور سیار نظام ہائے شمسی قنوان وغیرہ موجود ہیں۔ آباد فضا بھی بے اندازہ ہے اور نہیں معلوم کہ خلا ایتھر کہاں شروع اور ختم ہوتا ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

یہی باعث ہے کہ بقول سپنسر SPENCER مادہ متحد الجنس اشیاء سے مختلف الجنس اشیاء کی تکوین کے لئے ایک آزاد حالت سے لازبی کیفیت کی طرف چلتا تھا عالمِ حیوانات میں جاندار جس سادگی سے بناوٹ کی طرف بڑھتے ہیں اور اعلیٰ مدارج پر آتے ہیں، گلِ حکمت کے خمیر میں کثافت زیادہ ہوتی جاتی ہے یہی باعث ہے کہ شاعر کے دل کو اپنی کھوئی ہوئی لطافت کے حاصل کرنے کے لئے غم کی آگ میں جلنا پڑتا ہے غالب اُن لوگوں میں نہیں ہیں جو حدود کے قائل ہیں اور اُن کے سامنے اظہار عجز کر کے رُک جاتے ہیں۔ وہ لا ادریہ کی طرح یہ نہیں کہتے ہیں کہ حقیقت عالم پردہ غیب میں نہاں اور پنہاں ہے اور علم کے احاطہ سے باہر ہے۔ وہ حافظ کی طرح بیچارگی کا اظہار نہیں کرتے کہ رازیں پردہ نہاں است و نہاں خواہد بود۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ دلِ دانا اور چشم بینا کے لئے کوئی راز نہیں ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

گوش شنوا کو ہر وقت پیغامِ حقیقت پہونچتا رہتا ہے۔ عالم کا کون و فساد دن رات ہماری آنکھوں کے سامنے واقع ہوتا ہے۔ جو عالم سکون میں نظر آتا ہے وہ بھی چشم بینا کو مبتلائے فساد دکھائی دیتا ہے۔

صحیح ہے مادہ سالمات سے مرکب ہے۔ اگر پانی کے ایک قطرہ کو کرۂ ارض کے برابر خیال کریں تو اس کے سالمات چوگان کے گیند سے بڑے نہ ہوں گے یہ تمام سالمات رقصاں حلقوں کی مثال ہیں۔ سالمات اجزا سے مرکب ہیں جواب لا تجزیٰ خیال نہیں کئے جاتے بلکہ جواہر برق سے مرکب مانے جاتے ہیں۔ ہر جز کو اگر ایک کلیسا سے مشابہ خیال کریں تو بقول سر الیور لاج LODGE یہ جواہر کلیسا میں اُڑتی ہوئی مکھیوں کی مثال ہیں۔ اگر ان کو تخلیل پھر تحلیل کرے تو اُن کی ساخت حلقائے ایتھر سے ہوئی ہے اور اگر ایتھر کے حلقوں کی گرہ کھل جائے تو محض خیال باقی رہ جائے۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

وہ کیا چیز ہے جس نے خیال کو جو حقیقت میں اسی کل میں ذات باری ہے۔ اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ وہ مایا کے مختلف مادی لباسوں میں درجہ بدرجہ جلوہ گر ہوتا ہے جمال الٰہی اگر بہ لقائے اظہار حسن وجود چاہتا ہے تو وجود مادی کیوں اختیار کرتا ہے اس کا جواب مرزا غالب کے سوا آج تک دنیا کے کسی فلسفی نے نہیں دیا اور وہ جواب یہ ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

یہ اعتراض عائد کیا ہے کہ فرض کرو کہ تم اپنے دوست کو وجود نہیں اپنے پہلو میں موجود
تصور کریں تو اِس فلسفہ کی رو سے اُس کا غائب اور حاضر ہونا مساوی ہے
اس کا جواب یہ ہے کہ متخیلہ کی مدد سے کسی تصور کا قایم رہنا ایک مدام اور مسلسل کوشش
پر منحصر ہے جب تک تم اپنے دوست کا خیال کرتے رہو گے اور جتنی تکلیف اور محنت
تخیل کو کام میں لاؤ گے وہ نقش قائم رہیگا۔ جہان خیال اُس نقطہ سے آوارگی اختیار
کرے گا نقش محو ہو جائے گا۔ بخلاف اس کے موجود اشیا کا تصور کوشش سے
آزاد ہے۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جائے گا کہ اگر تمہارا فلسفہ یہ ہے کہ تمہارے وجود
سے عالم مادی کا وجود ہے تو اس کے معنی یہ ہوے کہ تمہارا خاتمہ خود دنیا کو ختم کردیگا
اس کا جواب یہ ہے کہ انا نے جہان مادہ کو اپنے تصور سے قایم کیا ہی ہیں یہ بھی علوم کیا
ہے کہ خود اُس سے مماثل اور بہت سے انا موجود ہیں جو میری ہی کی طرح سے فاعل اور
مختار ہیں۔ بہت سے مظاہر جو اس کے اثر اور اقتدار سے باہر ہیں ان کے اثر اور اقتدار میں ہیں

تمام مادہ جس میں خود میرا جسم اور بنی نوع کے اجسام شامل ہیں بے جان اور
بے کار ہے وہ روح وہ رواں وہ خیال جو ان پر فاعل ہے حقیقت ہے غالب
کا فلسفہ سپنوزا Spimoka بیگل Hegel برکلے Berkldey
اور فشطے Fichte سے ملتا ہے حکمت کی رو سے بھی مرزا غالب کا خیال

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرشِ ششِ جہت انتظار ہے

(۱۱)

غالب عالم کو مایا خیال کرتے ہیں

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

ہندوؤں کی قدیمی تعلیم ہے۔ لیکن ہندو عام طور پر اس کا مفہوم غلط سمجھتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ عالم کا وجود ایک فریبِ نگاہ ہے ایک دشتِ سراب ہے جو خواب میں نظر آتا ہے ایک خواب ہے جو چشمِ کور عالمِ رویا میں دیکھتی ہے مرزا غالب کی حقیقت میں عقل اس مغالطہ سے آزاد ہے۔ غالب لفظ ہستی کو ہمیشہ مادہ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں وہ مادہ کے منکر ہیں۔ عالم گو اجسامِ خارجی سے مملو نظر آتا ہے اور غایت لطیف غازیات سے لیکر غایت گراں فلزات تک عناصر سے پُر ہے مادہ کا وجود محض بالنسبت ہے بالذات نہیں۔ زندگی کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں حرکات۔ اصوات۔ الوان۔ کوئی وجود نہیں رکھتیں جب تک کہ ذہن اُن کا ادراک نہ کرے وجود کی بنا تصور پر ہے یہ تصور کوشش سے آزاد ہوتا ہے بعض نے اس کو

ایک ہی وقت میں ایک دوسرے سے آزادطور پر اس کا پتہ لگایا۔ میری رائے یہ ہے کہ ہر عہد کی ایک روح العصر ہوتی ہے جس کو المانی (Zeit geist) کہتے ہیں وہ روح القدس کی طرح حسب ضرورت زمانہ انسان کو تعلیم دیتی ہے۔ مرزا غالب نے بھی مسئلہ ارتقا کو پہچانا ہے۔ لوٹ زے (Lotze) کا بیان ہے کہ عالم کی یہ کیفیت ہے جس طرح بیج رفتہ رفتہ منازل بہ منازل نمو پذیر ہو کر تناور درخت ہو جاتا ہے۔ یہی حالِ عالم ہے فان ہارٹ مان (Von Hartmann) اس کا قائل ہے زمانۂ جدید کا سب سے بڑا فلسفی برگ سان (Bergson) اسی کو جانتا ہے اور کہتا ہے کہ حیات جو تمام عالم میں جاری اور ساری ہے بالذات آمادۂ ارتقا ہی دنیا برابر تکمیل پا رہی ہے اور منتظر ہے۔ مرزا غالب نے اس بات کو کس نزاکت سے کہا ہے

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دایم نقاب میں

یعنی معشوقِ عالم جو موجودات کے نقاب میں پنہاں ہے برابر اپنی جمال آرائی میں مصروف ہے اور آئینہ نقاب ہی میں لئے ہوئے اپنے غازہ کو درست کر رہا ہے جب عالم تکمیل کو پہنچ جائے گا تو نقاب اُلٹ دے گا۔ عالم کو دیکھنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کسی چیز کی کمی ہے شش جہت آراستہ ہو رہے ہیں اور منتظر ہیں۔

خدا کو خالق اور ماسوا کو مخلوق خیال کرتے ہیں۔ خدا دنیا سے بے تعلق اور آزاد ہے
ثنویت کے پیرو نیکی اور بدی کو اہرمن اور یزداں کی مثال ہمیشہ مصروف پیکار
بتلاتے ہیں مادہ اور روح کو متحد الذات نہیں بلکہ مختلف الذات کہتے ہیں۔

جدید ترین فلسفہ و حکمت کی تحقیقات وحدت الوجود کی طرف مائل ہے
سپنوزا (Spinoza) کا قول نہایت مسلم ہے وہ کہتا ہے کہ حکمت میں ہیکل
(Heckel) کا فلسفہ ان الفاظ میں بیان ہو سکتا ہے۔ عالم کا تمام نقد دلیہ الیہ
موجودہ زمانہ کی سب سے بڑی تحقیقات مسئلہ ارتقا ہے اگرچہ مسلمانوں کی کتب
ماضیہ میں بھی یہ مسئلہ موجود ہے اور الفارابی بو علی سینا اور خصوصاً الحسن کے نام سے
منسوب ہے اور بغداد کے کتب خانہ کی تباہی کے باوجود اخلاق ناصری رسائل اخوان الصفا
فوز الاصغر مثنوی معنوی وغیرہ میں اس کا ثبوت موجود ہے لیکن واقعات کے لحاظ سے
اس کا فخر زمانہ جدید ہی کو حاصل ہے ڈارون (Darwin) اور مرزا غالب
ہمعصر ہیں گو دونوں کو ایک دوسرے کا کچھ بھی علم نہ تھا۔

مسئلہ ارتقا کے متعلق ایک عجیب بات یہ ہے کہ ڈارون (Darwin)
سپنسر (Spencer) والس (wallace) ہیکل (Heckel)
وائسمین (Weismann) منڈل (Mendel) وغیرہ نے تقریباً

ہو جاتا ہے تو من و تو کے امتیازات مٹ جاتے ہیں اور اللہ و غیر اللہ کا فرق باقی نہیں رہتا

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے

کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

منصور کا انا الحق پکارنا اور بایزید بسطامی کا یہ کہنا کہ خدا میرے ملبوس میں ہے اسی کیفیت کا ثبوت ہے سرمد کی طرح غالب کہتے ہیں

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے

ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

وحدت الوجود کا مسئلہ تصوف سے مخصوص نہیں معتزلہ کا بھی یہی مذہب ہے غیلان دمشقی واصل ابن عطا عمر ابن عبید۔ مادہ روح اور خدا تینوں کو ازلی اور ابدی خیال کرتے ہیں۔ خود فلسفۂ قدیم اور جدید میں یہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ تسلیم کیا جاتا ہے فلسفے کے جملہ مدارس دو فریق میں تقسیم ہیں۔ وحدت الوجود کے قائل کہتے ہیں تمام عالم مادی کو اگر تحلیل کیا جائے تو ایتھر رہ جاتا ہے اور ایتھر خود تحلیل ہو کر خیال اور خیال تحلیل ہو کر صرف مسبب الاسباب باقی رہ جاتا ہے افعال کی نیکی اور بدی محض تعلق مادی کی وجہ سے نظر آتی ہے ورنہ جو شے ایک کے خیال میں نیک ہو وہی دوسرے کے خیال میں بد ہے بالذات نیکی و بدی کا وجود نہیں توحید کے قائل

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے　　　پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی　　　ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب

آخر تو کیا ہے۔ اے "نہیں ہے"

وادیٔ حیرت کا راستہ نہایت پر خطر ہے۔ بہت سے طالبِ حقیقت اس سے آگے نہیں پہنچ پاتے۔ یہ سراب۔ اور تشنہ لبی کی کیفیت ہے

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر

تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

لیکن جو اہلِ ظرف ہیں وہ بدیر و بدقت اس وادی کو طے کر جاتے ہیں مرزا غالب اس کیفیت کو جب یہ حجاب اُن کی نگاہ سے رفتہ رفتہ اُٹھ رہا ہے یوں بیان کرتے ہیں

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریٔ وہم

کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

آہستہ آہستہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہ ہنگامہ یہ پری چہرہ لوگ یہ غمزہ و عشوہ و ادا یہ زلفِ عنبریں یہ نگہ چشمِ سرمہ سا یہ سبزہ و گل۔ یہ ابر و ہوا اصنامِ خیالی ہیں اس کثرت کا تسلیم کرنا پرستاریٔ وہم ہے حقیقت سب کی وحدت ہے جب طالب حقیقت نے دو چار

مرزا غالب نے اپنی اس کیفیت کو جس خوبی سے اپنے کلام میں بیان کیا ہے اُس کی مثال موجود نہیں۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے — نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس وجہ سے اتنی طویل تقریر کی ضرورت پڑی کہ یہ ایک نہایت اہم مذہبی مسئلہ ہے اور نکتہ چیں حریف جو ہمیشہ اسلام کے نورانی چہرہ پر بیجا و بیجا اعتراض کے بدنما داغ لگانے کی تک میں رہتے ہیں مسلمان مصنفوں کے ہر ایک قول کو توڑ مروڑ کر اپنے مفید مطلب نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مرحوم کے بیان میں اس مسئلہ کا مفہوم کسی قدر مشتبہ و محتمل المعنیین تھا اس لئے میں نے جسارت کی کہ میں اس کو زیادہ صاف کردوں تاکہ اس سے کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو سکے حقیقت میں ایسے ہی مغالطوں سے مخالفین اسلام نے آئمہ مسلمین و اکابر صوفیہ کو عقیدہ ہمہ اوست کے لحاظ سے مفہوم کا قائل قرار دیکر اسلام میں رخنہ اندازی او فتنہ پردازی کی کوشش کی ہے۔ واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔ خاکسار محقق مخفی اکوان

عاجز ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک مدام حیرت اور استغراق کا عالم طاری ہو جاتا ہے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہ کبھی بھی نہیں مانا کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہے" البتہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ "درحقیقت خدا کے سوا اور کوئی چیز موجود ہی نہیں کیونکہ اُن کے نزدیک

چیزے کہ وجود او بخود نیست - ہستیش نہادن از خرد نیست

یہ بدیہی بات ہے کہ کوئی شخص اپنی تمام سوفسطائی کے باوجود بھی کم سے کم خود اپنے وجود کا انکار نہیں کرسکتا اور اگر وہ اس سے انکار کرے بھی تو اس کا یہ انکار خود ہی اس کے موجود کا ثبوت ہوگا۔ اَب اگر اس پر بھی وہ وحدت وجود کا دعویٰ کرتا ہے تو اُس کا مطلب یہی کریا تو وہ بھی خدا ہے۔ یا خدا کوئی چیز نہیں۔ لیکن یہ دعویٰ اس صدائے انا الحق کی عین ضد ہے جو شدتِ محویت اور فرط استغراق میں کسی کی زبان سے نکلتی ہے ایک عین خود فراموشی ہے دوسری انتہائے خود پرستی ایک عین عبادت و عبودیت ہے۔ دوسری انتہائے رعونت اور فرعونیت یعنی ایک اسلام ہے اور دوسری الحاد مسلمان صوفیوں اور شاعروں نے ہمیشہ نفی ماسوا کی تلقین کی ہے یہاں تک کہ جب وہ وحدت وجود کے قائل ہوئے ہیں اور انھوں نے "ہمہ اوست" کہا ہے تو اس سے بھی انکا مطلب یہی رہا کہ لا الٰہ الا اللہ لاموجود الا اللہ لاموثر فی الوجود الا اللہ (اُردوئے معلیٰ غالب صفحہ ۳۳۴)

آخر میں میں ناظرینِ کرام کے سامنے یہ عذر پیش کرتا ہوں کہ مجھے اس مسئلہ کی نسبت صرف

مطالعہ کرنا ناممکن ہے جسقدر حقیقت عالم پردہ سے روشنی میں آتی جاتی ہے دماغ

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) تو گویا اُس نے بظاہر اُن کو مطیع و مغلوب کر لیا۔ مگر ان کے آبائی اور پشتینی خیالات پر غالب نہ آسکا اور انہوں نے تصوف کے پردہ میں توحید کو وحدت الوجود کے قالب میں بدل لیا جو اِن کے قدیم عقائد تعدد آلہہ کے مطابق تھا چنانچہ علامہ شبلی مرحوم اس کی نسبت فرماتے ہیں کہ "یہ بتانا مشکل ہے کہ اسلام میں یہ خیال کیونکر آیا آجکل کے ارباب تحقیق کی رائے ہے کہ یونان اور ہندوستان اس خیال کے ماخذ ہیں کیونکہ ہندو اور یونانی دونوں "ہمہ اوست" کے قائل تھے لیکن اس کا تاریخی ثبوت ملنا مشکل ہے۔ زیادہ شبہ اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ یونانی علوم و فنون کی توسیع و اشاعت کا جو زمانہ تھا یعنی پہلی دو تین صدیاں اُس وقت یہ خیال نہیں پیدا ہوا تھا۔ اس مسئلہ کی ابتدا یا ظہور شیخ محی الدین ابن عربی کے زمانہ سے ہوا جو شیخ سعدی اور عراقی وغیرہ کا زمانہ ہے (شعر العجم حصہ پنجم ص ۱۴۳)

اس عبارت میں یورپ کے مدعیان تحقیق کی رائے پر دبی زبان سے فقط شبہ ظاہر کیا ہے اور وہ بھی صرف کمیابی ثبوت کی بنا پر۔ حالانکہ اصل یہ ہے کہ اہل اسلام نے یونان اور ہندوستان کا مسئلہ ہمہ اوست کبھی تسلیم ہی نہیں کیا۔ اور جو لوگ اس کا دعوی کرتے ہیں انہوں نے اسلامی عقیدہ وحدت الوجود کو سمجھا ہی نہیں اور محض شاکت اسمی کی وجہ سے اس دھوکے میں پڑ گئے کہ یہی عقیدہ ہمہ اوست ہے۔ جو غیر مسلم اقوام میں مسلم تھا۔ حالانکہ مسلمانوں نے

خوردبین سے اس کا مشاہدہ کیا جائے تو وہ ایک آتشکدہ معلوم ہوگا جس کی کیفیت کو

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور اس کا یوں ماننے والا مسلمان نہیں۔

بزرگان اسلام نے اس مسئلہ کی توضیح کے لئے عام طور پر جو مثالیں پیش کی ہیں اُن سے بھی میرے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ خدا اور کائنات کی تمثیل آفتاب و ذرہ، آئینہ اور عکس، روح اور جسم وغیرہ سے دیجاتی ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا اقتباسات میں علامہ شبلی مرحوم نے بھی یہی مثالیں دی ہیں۔ لیکن یہ سب مثالیں ایسی ہیں کہ حقیقی یکسانیت یقیناً نہیں ہے۔ غالب کہتا ہے

گفتمش ذرہ بہ خورشید رسد گفت محال   گفتمش کوشش من در طلبش گفت واست

ظاہر ہے کہ ان مثالوں سے کسی طرح بھی عالم میں وحدت وجود ثابت نہیں ہو سکتی البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کا اظہار دوسرے کے بغیر صورت پذیر نہیں ہو سکتا۔ اور یہ احتیاج اور نیازمندی ہی خدا اور دنیا سے ان کی تشبیہ میں وجہ شبہ ہے اور اس لحاظ سے یہ سب عین اسلامی عقیدہ وحدت الوجود کی مثالیں ہیں۔

یہی وہ فرق ہے جو اس بارے میں اسلامی اور غیر اسلامی عقائد میں پایا جاتا ہے اہل یورپ اس بات کے مدعی ہیں کہ یہ عقیدہ مسلمانوں نے ہندوؤں سے لیا ہے اور وہ اس کی صورت یہ بیان کرتے ہیں کہ جب اسلام عرب سے نکلکر آریہ نسل کے ایرانیوں میں پھیلا

جس قدر علم میں زیادتی ہوتی جاتی ہے ماہیت سے بعد ہوتا جاتا ہے۔ شرارہ کا عریانی

اَنکھ سے نظارہ کرنا اور اس سے واقف ہونا آسان ہے۔ لیکن اگر طاقت در

حاشیہ صفحہ گذشتہ) بہر حال ان دونوں باتوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ تصوف کی دنیا یکسر صدائے گونج اٹھی

سوی اللہ واللہ مافی الوجود

لیکن انہی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ انکار وجود ماسوا بر سبیل کنایہ و مجاز تھا نہ

بطریق حقیقت۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ کسی ایک محبوب چیز کی طرف یکسوئی اور خلوص سے

متوجہ ہو کر اس کے سوا باقی تمام اشیاء کو بھول جانا اس اشیاء کو فی الواقع معدوم نہیں کر دیتا

اور نہ اس خاص چیز کا دائمی تصور اسے باقی اشیاء میں جلوہ گر کر سکتا ہے اور اگر کسی شخص کے

خیال میں ایسا ہو بھی جائے تو یہ یقیناً خود اس کی محویت کا نتیجہ ہوگا نفس الامر میں ایسا ہونا محال

ہے۔ غالب نے اسی اصول کے مطابق کہا ہے۔

خطے بود کی عالم کشیدیم از مژہ بستن ۔۔۔۔ ز خود رفتیم و ہم باخویشتن بردیم دنیا را

مسئلہ وحدت الوجود کے متعلق شعرائے متصوفین کے تمام اقوال اسی مفہوم کی تائید کرتے

ہیں اور اہل اسلام نے اس کو اسی طرح مانا ہے۔ ہاں اگر کسی خاص فلسفی نے اسکو اس کی منطقیانہ

حقیقت کے وسعت دے کر تسلیم کیا ہو کہ حقیقۃً کائنات میں ایک کے سوا دوسری کوئی چیز ہے ہی نہیں تو

اس سے ہم کو یہاں سروکار نہیں ہے ہم فقط یہی کہیں گے کہ یہ عقیدہ اس صورت میں تعلیم اسلام کے بالکل خلاف ہے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) کیوں یہ دعویٰ نہ کرے کہ

ہر کہ آید در نظر غیر تو نیست   یا توئی یا بوئے تو یا روئے تو

اور کیونکر نہ کہے کہ

در ہر چہ بنگرم تو بہ دیدار بودۂ   اے نانمودہ رخ تو چہ بسیار بودۂ

جو شخص حقیقت میں اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے اسے برای العین ہر شے میں اسی جمال جہان آرا کا جلوہ نظر آتا ہے اور وہ ہر ایک چیز کو اسی ذات سبوح و قدوس کی حمد و ثنا کا نغمہ خواں پاتا ہے

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ

اس حالت میں وہ خود اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ

ہر چیز کہ آں نشان ہستی دارد   یا پرتو روئے اوست یا اوست بعینہ

یہی عشق حقیقی کا معراج کمال اور فنا فی اللہ کا درجہ ہے بیدل نے اس مضمون کو زیادہ صاف اور واضح کر کے یوں ادا کیا ہے۔

پیوستگی بحق ز دو عالم بریدن است   دیدار دوست ہستی خود را ندیدن است

پرواز سایہ جز بسر بام مہر نیست   زخود رمیدن تو بحق آرمیدن است

بس علت العلل وہ ذات یا طاقت ہے جو حرکت کے پس پشت حرکت کو تعین دیتی ہے

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے

پرتو سے آفتاب کے ذرہ میں جان ہے

ہے تجلی تری سامانِ وجود ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ) اس خیال کو اور زیادہ تقویت و ترقی یوں ہوئی کہ تصوف کا مدار ہے عشق

محبت پر۔ اور محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کے سوا ساری دنیا سے قطع نظر کر لی جائے اور جہاں

جو چیز نظر آئے وہ اُسی ایک کی یاد دلائے۔ بیدل مرحوم نے خوب کہا ہے۔

خیال این و آں حاشا کہ گنجد در دلِ مجنوں بہ لیلیٰ ہر کہ گردید آشنا محمل نمی داند

چہ افسونست یارب چشم بندِ کیمیائے الفت را کہ بلبل جز چمن۔ پروانہ جز محفل نمی داند

اسی لئے عشق مجازی کی یہ خودی ہے کہ

بسکہ در چشم و دلم ہر لحظہ اے یارم توئی ہر کہ آید در نظر از دور پندارم توئی

اور محبت ظاہری کی یہ محویت ہے۔ کہ

در دو دیوار من آئینۂ کثرتِ ذوق ہر کجا می نگرم۔ روئے ترا می بینم

تو پھر اُس حسن ازل کا دلدادہ۔ ع

جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

متعین نہ ہو۔ اگر حرکت میں قاعدہ نہ ہوتا تو دنیا عالم فساد سے عالم کون میں آ سکتی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) میری رائے میں اس خیال کی بنا بھی اسی طرح ہوتی ہے جس طرح اس کے فلسفیانہ مفہوم کی ابتدا ہوئی تھی یعنی جیسے زمانہ قدیم وجدید کے حکما نے مرکبات کو عناصر عناصر کو اجزائے دیمقراطیسی اور اجزائے دیمقراطیسی کو حلقہائے ایتھر اور برقیوں میں تحلیل ہوتے ہوئے دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ کائنات میں ایتھر کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور یہ تمام گوناگون اشیا اسی کی مختلف صورتیں ہیں۔ اسی طرح لیکن اس سے جداگانہ اور آزادانہ طریقے سے صوفیہ نے اشیائے عالم کی ناپائداری اور بے ثباتی کو دیکھ کر اور اسلام کی تعلیم کردہ عقیدہ توحید ذاتی کو مدنظر رکھ کر یہ تسلیم کیا کہ مادے کی یہ تمام خاصیتیں اور قابلیتیں اور ایتھر کی یہ ساری جلوہ آرائیاں ایک ذات بےچون وچگوں کے علم اور قدرت سے ہیں۔

سیل وجو با مراد او روند　　　اختراں زاں ساں کہ او خواہد شوند
بے رضائے او نیفتد ہیچ برگ　　　بے قضائے او نیاید ہیچ مرگ
بے مراد او نہ جنبد ہیچ رگ　　　در جہاں ز اوج ثریا تا سمک

اس لئے اس کی ہستی کے سوا اور کسی کی ہستی کو ہستی کہنا ہی غلط ہے جو کچھ ہے وہی ہے اور جہاں میں سب ہیچ ہے

اے عین بقا! در چہ بقائے کہ نہ　　　در جائے وکدام جائے کہ نہ
اے ذات تو از جا و جہت مستغنی　　　آخر تو کجائی و کجائے کہ نہ

مادہ خود بے جان اور جامد ہے۔ جو چیز مادہ کو تحریک و جنبش میں لاتی ہے وہ حرکت ہے مگر حرکت خود اپنی ذات سے آفرینش کی قدرت نہیں رکھتی جب تک

(صفحہ گذشتہ) اور اگر ہے تو وہی خدا ہے۔ اور خالق اور مخلوق ایک ہی ہے۔ نہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ عالم مادی اور اپنی ناپائداری اور سرعت انقلاب کی وجہ سے قابل اعتبار اور لائق اعتنا نہیں ہے اور اس کے اس وجود عارضی میں بھی جو کچھ حرکت۔ رونق و کشش ہے وہ اسی حسن ازل کا پرتو ہے ورنہ یہ خود ایک جسم بے جان اور قالب بے روح ہے۔ اسی سبب سے اس ہستی واجب الوجود کے مقابلے میں ان اشیائے بے بقا اور ان کی حیات بے ثبات کا نام لینا بھی گناہ ہے۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے اس مضمون کو خوب ادا کیا ہے۔

کہ ہامون و دریا و کوہ و فلک　　پری آدمی زادہ۔ دیو و ملک
ہمہ ہرچہ ہستند زاں کمتر اند　　کہ با ہستیش نام ہستی برند

غرض ان کا یہ عقیدہ کہ ؎

عالم ہمہ اوست۔ بلکہ گویم ایں را

مجازاً ہے حقیقتاً نہیں ہے۔ اور چونکہ وہ تمام دنیا کے وجود کو زوال آمادہ اور فنا پذیر پاتے ہیں اس لئے کہتے ہیں کہ۔

پس باش یقیں کہ نیست و اللہ　　موجود حقیقی سوے اللہ

دکھائی ہے۔ غالب عالم ناسوت میں کہتے ہیں۔

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے

طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کہ اس کے سامنے ساری دنیا بلکہ خود اپنی ذات تک کو بھول گئے۔ ایک میں انا کا اتنا زور ہوا کہ عالم مادی کا وجود ہی اپنے اور اپنے معائل وجودوں کی انانیت پر مبنی سمجھا گیا۔ دوسرے میں اپنے وجود کو اتنا موہوم بلکہ معدوم ٹھہرایا کہ انا کہنا ہی گناہ قرار پایا۔ عراقی کہتا ہے۔

ہر کہ او دعوائے ہستی میکند　　　آشکارا بت پرستی میکند

بیدل کا قول ہے

وہم شہرت بہانہ ایم ہمہ　　　ہمہ مائیم و مانہ ایم ہمہ

"من و تو" راست نیاز من و تو　　　سازِ او را ترانہ ایم ہمہ

اصل بات یہ ہے کہ اگرچہ نام کو وحدت الوجود کا مسئلہ تصوف میں داخل رہا لیکن حقیقت میں یہ کبھی اپنی انتہائی حد تک نہیں پہنچا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جس طرح فلسفیوں نے یہ کہا کہ کائنات میں اجزاے مادی یا علی الخصوص ایتھر کے سوا اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے اس طرح صوفیوں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ خدا کے سوا اور کسی مادی شے کا وجود حقیقتہً ہے ہی نہیں

(بقیہ صفحہ گذشتہ) یہ ایک مشکل سوال ہے اور اس کا شافی جواب دینا آسان نہیں چنانچہ علامہ مرحوم اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔ "اس صورت میں یہ مسئلہ اسقدر مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کی تعبیر سخت مشکل ہے ہم نے اس مسئلہ پر شیخ محی الدین اکبر کی تحریریں دیکھی ہیں مولانا عبدالعلی بحرالعلوم اور علامہ محبی نے جو مستقل رسالے اس مسئلے پر لکھے ہیں وہ بھی ہمارے پیش نظر ہیں لیکن ہم ان کے سمجھنے سے عاجز ہیں۔ جو کچھ ان بزرگوں نے لکھا ہے ہمارے صوفی شعراء نے اس سے زیادہ صاف اور روشن لکھا ہے اور ہم انہی کے خیالات نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔۔۔

فلسفے میں یہ مسئلہ محض ایک لطیف مادی بحث ہے یعنی ازل میں اجزائے دیمقراطیسی تھے وہ ملکر مادہ بنا۔ مادے نے مختلف صورتیں اختیار کیں۔ لیکن تصوف میں یہ مسئلہ ہمہ تن روحانیت ہے تصوف کی نظر میں تمام عالم شاہد حقیقی کا جلوہ ہے۔ جو کچھ نظر آتا ہے۔ اسی کے کرشمے اور ادائیں ہیں۔ ایک روح ہے جو تمام اشیاء میں ساری ہے ایک نور ہے جس سے تمام فضائے ہستی روشن ہے۔ ایک آفتاب ہے جو ہر ذرہ میں چمک رہا ہے۔" (کتاب مذکور ص۱۲۲،۱۲۳)

بلاشبہ یہ وہ باریک اور نازک فرق ہے جس سے باوجود اشتراک اسمی اس مسئلے کے فلسفیانہ اور صوفیانہ مفہوموں میں بعد المشرقین ہو گیا ہے۔ ایک میں مادہ پرستی اتنی بڑھ گئی کہ خدا کا خیال ہی دل سے مٹ گیا۔ دوسرے میں خدا شناسی اتنی زیادہ ہوئی

اہلِ تصوف نے اس راہ کو جو طالب کو مطلوب حقیقی تک لیجاتی ہے تین

عوالم یا سات واسطوں میں تقسیم کیا ہے۔ ابتدائی عالم عالمِ ناسوت ہے اس میں

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ہیگل کے فلسفے سے کی گئی ہے۔ علامہ شبلی مرحوم نے شعر العجم میں ایک مقام پر فلسفیانہ وحدت الوجود کی حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ حکماء میں سے اہلِ مادہ اس بات کے قائل ہیں کہ عالم کا بنانے والا عالم سے کوئی الگ چیز نہیں بلکہ ازل سے ایک مادہ ہے جس نے مختلف صورتیں اختیار کیں اور اختیار کرتا رہتا ہے۔ ابتدا میں چھوٹے چھوٹے ذرات تھے جنکو اجزاء دیمقراطیسی کہتے ہیں۔ یہ اجزا باہم ملے اور ان کے ملنے سے زمین آسمان سیارے وغیرہ وجود میں آئے۔ چونکہ ان ذرات میں حرکت اور قوت بھی ازل سے موجود ہے۔ اس لئے یہ تغیرات خود اس کی ذات سے وجود میں آتے ہیں کسی اور خالق یا صانع یا محرک کی ضرورت نہیں ہوتی اس قسم کی وحدت وجود دہریوں اور مادیوں کا مذہب ہے۔ حضرات صوفیا اس وحدت کے قائل نہیں ہو سکتے باینہمہ اس قدر قطعی سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہے ایک ہی ذات ہے۔ موجودات خارجیہ سب اسی کے شئونات ہیں۔" (شعر العجم حصہ پنجم ص۱۲۲)

اب یہاں از خود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھا تو پھر وہ مسئلہ وحدت الوجود کیا ہے۔ جو اسلامی تصوف کا جزو اور حضرات صوفیہ کا ایمان کہا جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ

سوا اور کسی نے اس خوبی سے اس کو نظم نہیں کیا۔ (یوسف زلیخا ص ۲۷)

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ہیں نظر آتی ہیں۔ اس کے حکم کے مطابق اور اس کے منشا کے موافق ہوتی ہیں۔ انہی میں سے جو معدودے چند احکام الٰہی تجربے یا اتفاق سے انسان کے دائرۂ فہم میں آ گئے ہیں اس نے ان کا نام قوانین قدرت رکھ لیا ہے اور بہ زعم خود ان کی موجب اور مقنن سے ہمیشہ کے لئے بے نیاز ہو گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں ہر چیز میں اسی کا حکم جاری اور اسی کا جلوہ نمایاں ہے۔ اسی وجہ سے میرے خیال میں کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ مسئلہ وحدت الوجود کا وہ مفہوم جس کی تشریح اوپر کی گئی ہے کسی حیثیت سے بھی عقائد اسلامی میں شامل ہو سکے بلکہ اصل تو یہ ہے کہ اس شان سے یہ مسئلہ مادہ پرست فلاسفہ کے سوا اور کسی مذہب میں بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

میرا اعتراض جو کچھ ہے وہ صرف اس بات پر ہے کہ جس مسئلے کو غالب اور جامی کا قول اور اسلامی تصوف کا عقیدہ ٹھہرایا ہے بعینہٖ اسی کو معتزلہ کا مذہب اور جدید ترین فلسفے اور حکمت کی تحقیقات بھی قرار دیا ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ وحدت الوجود کا مسئلہ اسلامی تصوف کا ایک بڑا جزو ہے اور شعرائے متصوفین نے اس کو سیکڑوں طرح سے باندھا اور صدہا اسلوب سے ادا کیا ہے۔ البتہ مجھے کلام اس بات میں ہے کہ یہ وہی عقیدہ ہے جس کی تعبیر و تطبیق غیلان اور واصل کے قول اور سپینوزا اور

مذکورۂ بالا شعر میں مرزا غالب نے اس کو ظاہر کیا ہے۔ مولانا عبدالرحمن جامی کے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) دو فریق میں تقسیم ہیں۔ وحدت الوجود کے قائل کہتے ہیں۔ تمام عالم مادی کو اگر تحلیل کیا جائے تو ایتھر رہ جاتا ہے اور ایتھر تحلیل ہو کر خیال۔ اور خیال تحلیل ہو کر صرف مسبب الاسباب باقی رہ جاتا ہے۔............ توحید کے قائل خدا کو خالق اور ماسوا کو مخلوق خیال کرتے ہیں.............. جدید ترین فلسفے اور حکمت کی تحقیقات وحدت الوجود کی طرف مائل ہے۔ سپنوزا کا قول نہایت مسلم ہے۔ وہ کہتا ہے "حکمت میں ہیگل کا فلسفہ ان الفاظ میں بیان ہو سکتا ہے۔" عالم کا تمام نقد و نسیہ ایتھر ہے۔" (الخ) اس عبارت کے پڑھنے سے خود بخود یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وحدت الوجود اور توحید دونو بالکل مختلف بلکہ متضاد مسئلے ہیں۔ اور ایک کا قائل دوسرے کا معتقد نہیں ہو سکتا۔ ایک کے نزدیک تمام کائنات بالکل یکساں اور متحد الذات ہے جس میں نہ کوئی خالق ہے نہ کوئی مخلوق۔ جو کچھ ہے وہ ایتھر ہی ایتھر ہے اور یہ تمام اختلاف صور جو نظر آتا ہے اسی کے مختلف مدارج کثافت و لطافت اور تغیر و تبدل حالات کی وجہ سے اسی کی خصائص طبعی کی بنا پر رونما ہوا ہے جس میں کسی غیر کا مسبب یا فاعل کی حیثیت سے بھی دخل نہیں ہے اس لئے اگر مانتے ہو تو اسی ایتھر کو خدا مانو ورنہ اس کے سوا اور کسی کا وجود نہیں۔ دوسرے کے نزدیک خالق مخلوق سے بالکل الگ ہے۔ خدا کی ذات تمام حوادث و تغیرات سے ارفع اور اعلےٰ ہے۔ اور یہ سب تغیر تبدیلیاں جو عالم اسباب

وجود میں آئی ہے۔ دنیا ایک آئینہ ہے جس میں حسن ازل خود بیں ہے یہ خیال مرزا غالب کا اپنا خیال نہیں بلکہ اسلامی تصوف کا عقیدہ ہے[۱]۔ مگر حسن خوبی کے ساتھ

[۱] اس رائے سے میں باادب اختلاف کرنے کی جرات کرتا ہوں مسئلہ وحدت الوجود کا جو مفہوم اس مضمون میں جابجا سمجھایا گیا ہے وہ قطع نظر اس کے کہ فی نفسہ صحیح ہو یا غلط، عقاید اسلام سے خارج ہی نہیں بلکہ اسلامی تعلیم کا عین مخالف ہے۔ کیونکہ یہاں اس کی کچھ تشریح نہیں کی گئی لیکن ذرا آگے چلکر یہ کہا گیا ہے کہ "وحدت الوجود کا مسئلہ تصوف سے مخصوص نہیں معتزلہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ غیلان دمشقی۔ واصل ابن عطا۔ عمر ابن عبید۔ مادہ۔ روح اور خدا تینوں کو ازلی اور ابدی خیال کرتے ہیں"۔ اس فقرے سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ جس مسئلہ وحدت الوجود کا قائل غالب کو ٹھیرایا گیا ہے اور جسے اسلامی تصوف کا عقیدہ کہا گیا ہے وہ یہی خیال ہے لیکن ہر مسلمان خود اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ خیال خواہ کسی کا ہو لیکن اسلام کا ہرگز نہیں ہے اسلام نے صفت ازلیت وابدیت میں تنہا کسی خدا کا شریک نہیں مانا۔ اور اُس کے سوا روح۔ مادہ۔ یا اور کسی شے کو بھی قدیم نہیں مانا۔ اسلامی تعلیم کا اصل اصول و راس العقائد توحید ہے اور جس عقیدے میں اس کی مخالفت کا شائبہ بھی ہو وہ یقیناً مذہب اسلام کے خلاف ہے۔ بعض لوگوں نے خود ہی مسئلہ وحدت الوجود کی حقیقت کو واضح کر کے اس بات سے پردہ اٹھا دیا گیا ہے کہ اس میں اور خالص توحید میں کتنا فرق ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ فلسفے کے جملہ مدارس

تنگ ہوں قدیم شعرا اور جدید شعرا سب پایاب پانی ہیں یہ انکی مثال خشک دریاؤں کی سی ہے ان کا تخیل تعمق سے خالی ہے۔ ان کے احساسات سطحی ہیں تعیش اور رندی کے چند جذبات کے سوا ان کے دیوانوں میں کچھ نہیں۔" مرزا کی شاعری اس الزام سے مطلق بری ہے۔ غالب کا دل ایک آئینہ ہے جس میں ہر مظہر الٰہی اور منظر قدرت کا جلوہ موجود ہے۔ اس کی زبان ترجمان حقیقت ہے اس کے پرکار تخیل کا دائرہ دائرۂ امکان سے ہمکنار ہے۔ عالم کون فساد میں ایک ذرہ کی جنبش بھی اس کے حلقۂ غور سے باہر نہیں ہے۔ غالب ایک فلسفی ہے جو شاعری کا جامہ زیب تن کئے ہوئے ہے۔

(۱۰)

غالب وحدت الوجود کے قائل ہیں وہ خدا کو ماسوا سے علیحدہ نہیں خیال کرتے بلکہ اُن کا مذہب ہمہ اوست ہے۔ فلسفہ میں کوئی سوال اس سے زیادہ مشکل نہیں کہ دنیا کی آفرینش کس وجہ سے ہوئی ہے غالب اسکا جواب دیتے ہیں اور کہتے ہیں

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

مبداء عالم حسن ہے اور حسن کو تقاضائے اظہار ہے اس لئے دنیا عدم

جس کو سرمستی سے مترادف کہا جا سکتا ہے جس میں شاعر آفتاب اور ماہتاب کو اپنے
کف دست میں اٹھا لیتا ہے اس سرمستی کے عالم میں بھی مرزا نے کلام موزوں کیا ہے
مرزا کی دیوانگی جرمن دیوانے شاعر الفرڈ مام برٹ Alfred Mombert
سے کچھ کم نہیں مام برٹ اپنے جنون میں کہتا ہے۔

Da Mond und sonne dir ewig kalt ist.
Und dir das sternengewoelbe ewig alt ist.
Und in der Finsternis zerreisst dein Gang:
Lauache meinem Gesang

مرزا فرماتے ہیں

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہگذار باد یاں

مرزا اور مام برٹ دونو ظلمات کی تاریکی میں داخل ہوئے ہیں اور
سکندر کی آخری منزل سے بھی آگے نکل گئے ہیں لیکن مرزا صحیح سلامت خضر کی طرح
واپس آ گئے ہیں اور وہ غریب ہمیشہ کے لئے وہیں رہ گیا ہے۔
Da Mond und sondre
فریڈرش نطشے اپنی تصنیف بقول زردشت میں لکھتا ہے "میں شعرا سے

غمِ آغوشِ وداع میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

بجا ہے گر نہ سنے نالہائے بلبلِ زار
کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

لیکن شاعرانہ جذبہ اور وجدان میں ایک ایسی کیفیت بھی واقع ہوتی ہے

بودلیر (BAUDELAIRE) لکھتا ہے کہ شاعرانہ کیفیت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب تمام حواس نہایت درجہ تاثیرات پذیر اور ذکی الحس ہو جاتے ہیں آنکھیں پردۂ ابد تک دیکھنے لگتی ہیں پر شور مقامات میں خفیف سے خفیف آواز کو کان سننے لگتے ہیں اور شور سے بالکل ناآشنا رہتے ہیں۔ اختلال خیالات واقع ہوتا ہے اور جملہ اشیائے عالم اپنی صورت سے بسا اوقات دوسری صورتوں میں منقلب ہو جاتی ہیں اور خیالات میں ناقابل حل اطلاقی تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ آوازیں رنگین معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور رنگ میں نغمہ پیدا ہو جاتا ہے۔ غالب کو نشۂ شاداب و رساز مست اور نغمہ آب رواں اور جام سرو سبز نظر آتا ہے۔ لیکن غالب میں کیفیت ایک نہایت معتدل انداز اور صحیح حد تک ہے۔ ریمبو (RIMBAUD) کی طرح اس حد تک نہیں پہنچی کہ جس طرح حروفی حروف کے اعداد میں معنی نہاں پاتے ہیں وہ ہر حرف میں ایک خاص رنگ پاتا ہے چنانچہ کہتا ہے۔

A NOIR, E BLANC, I RONGE, W VERT,

O, BLEW, VOYELLES

غالب کا اس انداز کا کلام سب سے زیادہ فرانسیسی شاعر ملارمے (MALLARME) سے مشابہ ہے

کی پاک اور خوف آمیز مسرت کو کیا جان سکتے ہیں جو فنون لطیفہ کی سرد اور بے داغ برف سے ڈھکی ہوئی مرتفع چوٹیوں میں گشت لگا رہے ہیں۔ کانٹ نے اپنی کتاب (Kritik dar Urtheilskraft) میں خوب کہا ہے کہ بہت سے اشعار ایسے ہوتے ہیں جن میں آزاد حسن ہوتا ہے وہ پھولوں کی طرح اپنے معنی نہیں بیان کرتے بلکہ اپنی خوشبو سے مشام جان کو مسرور کرتے ہیں۔ اگر ان کے نثر کرنے اور اُن کے مطالب کے دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ کوشش ایسی ہوگی جس طرح کوئی شخص پھولوں کی خوشبو کو پانے کی غرض سے ان کے پتوں کو توڑ کر علیحدہ کرے۔ بعض اوقات انسان پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے اس کیفیت میں خواب کی سی حالت ہوتی ہے خواب میں تخیلہ ادراک پر غالب آجاتی ہے اور عجیب پرلطف پریشان مطالب پیش کرتی ہے

پال ورلین (Paul Verlaine) کی مشہور نظم "میرا خواب" (Mon Reve - Familier) مرزا کے مفصلہ ذیل قطعہ سے کس قدر مشابہ ہے۔

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب

شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

غالب نشہ کو نخل کی طرح شاداب اور ساز کو مے گسار کی طرح مست بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیشۂ مے سرود کے جوئبار پر ایک سروِ سبز ہے۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پر کچھ اب کی سرگرانی اور ہے

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

اب سہل ممتنع سے قطع نظر کرکے مشکل اور غریب انداز پر غور کیا جائے تو عجیب تر صورت ہے۔ جو لوگ کہ گرم معتدل فرشِ ارض پر رہنے کے عادی ہیں وہ ان لوگوں

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا
اور درویش کی صدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی
مری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کیلئے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہِ دیندار نے شفا پائی

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

جب میں غالب کی غزلوں کو دیکھتا ہوں تو مجھکو معاً ابنِ رشیق کا قول یاد آتا ہے

فَاِذَا قِیلَ أَطمَعَ النَّاسَ طُرًّا

وَاِذَا رِیمَ أَعجَزَ المُعجِزِینَا

جب پڑھا جائے تو ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں مگر جب ویسا کہنے کا ارادہ کیا جائے تو سحرِ بیان عاجز ہو جائیں۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

سے واقف تھے اور اگر تمکو یہ فنون بدرجۂ کمال سکھا دیے جائیں تو تم بھی ایسی تصویر بنالو۔اس غلط اندازہ میں کبھی مبتلا نہ ہونا۔

جملہ فنونِ لطیفہ میں جن میں شاعری بھی شامل ہے بقول فرانسس ٹامپسن (FRANCIS THOMPSON) سادگی انتہائے اشکال ہے جب مصور نقش نازِ بتِ طناز کو حوالۂ تصویر کرنے کے لیے موقلم اُٹھاتا ہے یا شاعر اس مضمون کو جسکو ناواقف بزعم خود آسان جانتے ہیں ادا کرتا ہے تو بت یا مضمون مصور یا شاعر کے سامنے ایک نئی دنیا کی صورت میں نظر آتا ہے جس کو کولمبس کی مثال کوشش اور نہایت جستجو سے دریافت کرنا پڑتا ہے۔ میکائیل آنجلو کا قول ہے کہ تصویر ہاتھ سے نہیں بلکہ دماغ سے کھینچی جاتی ہے۔ جب لیونارڈو دو ونچی (LEONORDA DE VINCI) سے خانقاہ دیلا گراطیا کی Delle Grazia کے اسقف نے عشائے ربانی کی تصویر بنانے کے لیے کہا تو وہ کئی روز تک صبح سے شام تک اپنا موقلم ہاتھ میں لیے کھڑا رہا اور پردہ کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہر قسم کو دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ہم کو صرف ایک دھندلی سی کیفیت سے زیادہ دیکھنے کی قدرت نہیں سوائے ماہران فنون لطیفہ کے کوئی بھی عالم کے مظاہرات خارجی اور باطنی کو نہیں دیکھ سکتا اور اسی وجہ سے اُن کا اظہار نہیں کرسکتا۔

پردوں کو پھیلانے تک کی جگہ مفقود۔ چمن کی ہوا اور ہمدموں کی صدا تک نہیں آتی۔ لیکن تقاضائے حیات پھر بھی ناشکور کوششوں کا خواستگار ہوتا ہے۔ جب "دانہ بدلوں" کا زمانہ آتا ہے تو گو محض تنہائی اور تجرد ہے اور تنکوں کا مہیا کرنا بے معنی لیکن خس قفس میں ضرور جمع کر لیتا ہے۔

(الف) مرزا غالب کے کلام کی عجیب سادگی اور ہوشیاری اور عجیب بےخودی اور پرکاری انتہائے کمال ہے۔ بعض نقاد مرزا غالب یا ٹیگور کے کلام کی سادگی سے سخت مغالطہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اُن کے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ اس میں خوبی ہی کیا ہے ہر شاعر ایسا لکھ سکتا ہے یہ ایک فریب ہے ہر شخص اپنے ذہن میں یقین کرتا ہے کہ وہ اُن تمام اشیاء کو جو اس کے پیش نظر ہیں خوب جانتا ہے اور اِن کے حسن و عن بیان اور اظہار کی قابلیت رکھتا ہے۔ حالانکہ چند منتخب افراد کے سوا دنیا میں کوئی شخص اپنی گرد و پیش کی ادنیٰ اشیاء کی محض صورت سے بھی واقف نہیں یہی وجہ ہے کہ اگر اُس سے الفاظ یا رنگ یا آواز میں اُن کا نقشہ اُتارنے کو کہا جائے تو اُسکے دعوے کا باطل ثابت ہونا اور اس کا قاصر رہنا قطعی ہے کیا قدرت کے نظارے اور عورتوں کے اجسام کو دیکھنے کی ہر شخص نگاہ رکھتا ہے کیا گیوٹو (GIOTTO) اور لارن سے تی (LORENZETTI) کی سادہ تصاویر کا راز یہی ہے کہ وہ فن مو قلم کشی اور رنگ آمیزی

روشن رہتی تھیں وہاں اب جگنو اُڑتے نظر آتے ہیں۔ نباتات نے دست انسانی کی قطع برید سے آزادی پاکر ایک عجیب آوارگی اختیار کرلی ہے۔ پانی کے پاس درختوں کے سایہ میں جو پودے ہوتے ہیں وہ اکثر طویل اور نازک تن ہوتے ہیں جن کی شاخیں پتلی ہونے کے باعث پھول کے وزن سے بھی جھک جاتی ہیں۔ اور ذرا سے ہوا کے جھونکے میں اِدھر سے اُدھر لہرانے لگتی ہیں شام کے وقت اُن شاخوں کا عکس سبزہ پر بعینہٖ سانپ کی طرح نظر آتا ہے۔ اگر طبیعت پر ماندگی یا وحشت یا ہول کا اثر ہو تو اس افعی سے ڈرنا کوئی عجب نہیں۔

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے (۱۴)

بھلا اطبا کے علاوہ کون اس بات سے واقف ہے کہ زخم کے خراب ہو جانے کی علامت یہ ہے کہ اس کے اندر ہوا نفوذ کر جاتی ہے جو زخم سانس دینے لگتا ہے ضرور مہلک ثابت ہوتا ہے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

مرغِ قفس کو کس نے نہیں دیکھا کہاں بچھانے ناچہ وہ کہاں کہ کنج قفس جس میں

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی

(۱۰) نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

جنگ میں اس سے زیادہ کوئی مجبوری کا عالم نہیں جب تنگ گولی دل یا دماغ میں نہ لگے انسان کو لڑنے سے فوراً معطل نہیں کر سکتی۔ بسا اوقات جدید باریک کلاہ کی گولیاں شکم معدہ میں ایک جانب سے دوسری جانب بلا تکلف شکم سے پشت کی طرف نکل جاتی ہیں اور سوائے خارجی خفیف زخموں کے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ غشاء معدہ کے سوراخ فوراً خود بخود مندمل ہو جاتے ہیں پھیپھڑوں میں۔ جگر میں گولیاں بعض مرتبہ محسوس بھی نہیں ہوتیں اور قریب قریب جزو بدن ہو جاتی ہیں لیکن وقت ہنگام پاؤں پر گولی کا لگنا غضب ہے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ مرزا غالب نے میدان عشق میں بے بس ہو جانے کی کیا مثال دی ہے۔

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے

(۱۱) سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

ہندوستان میں مغلوں کے زمانہ کے بہت سے باغات غیر آباد اور ویران پڑے ہیں سنگ مرمر اور سنگ رخام کی بارہ دریاں شکستہ افتادہ ہیں۔ جہاں شہزادیاں اور بیگمات رہتی تھیں وہاں اب جنات اور پریوں کا مسکن ہے جن روشوں پر کافوری شمعیں

کی تاب نہ لاکر گھلایا جاتا ہے۔

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے

(۸) کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

جب آفتاب راہرو کی پشت کی جانب ہوتا ہے تو سایہ سامنے پڑتا ہے۔ مرزا دوپہر کے قریب اپنے مقتل میں جانے کے متعلق اپنے شوق کو یوں بیان کرتے ہیں کہ میرا سر پاؤں سے دو قدم آگے آگے ہے۔ اس کیفیت کو ہر شخص نصف النہار کے بعد خود دیکھ سکتا ہے۔

رگ و پے میں جب اُترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو

(۹) ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

قدرت نے قریب قریب جملہ مہلک سمیات کو تلخ بنایا ہے۔ ہندوستان میں جو زہر زیادہ تر خودکشی کے لئے مستعمل ہیں وہ تیلیا۔ سنکھیا۔ دھتورا۔ افیون۔ اور کچلہ ہیں یہ سب تلخ ہیں۔ اس لئے سب سے پہلی مشکل ان کا منہ تک لیجانا ہے۔ زہر کا فعل معدہ کے فعل ہضم کا محتاج اور دیرطلب ہے چنانچہ دوران سر۔ برودت اطراف۔ امتلا۔ نسیان۔ جریانِ خوں۔ عطش۔ ضیق النفس اور انقباض و تشنج جو موت کی علامات ہیں اُس وقت تک شروع نہیں ہوتیں کہ زہر سرایت نہ کر جائے۔ مرزا غم اور رنج کے اثر کا کیا خوب زہر سے مقابلہ کرتے ہیں۔ آغاز میں غم صرف تلخ معلوم ہوتا ہے لیکن انجام کار رفتہ رفتہ گھلا کر مار دیتا ہے۔

کہ شاعر نے آج تک آتش کے فرو ہونے کی اس ظاہر اور داخلی کیفیت کو مشاہدہ اور محسوس کیا ہے۔ لفظ "ہر کوئی" میں آگ کے طبعاً مغرور اور سرکش ہونے کا اشارہ نہایت خوبی سے مضمر ہے۔

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
(۷)
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

وینس   برِ اعظم یورپ کا حلب ہے۔ وینس کے بلوریں جام و ساغر مشہور ہیں ان کی نزاکت کا اندازہ بیان سے باہر ہے دیکھ کر بے اختیار جی چاہتا ہے کہ صناعوں کے ہاتھ چوم لے۔ آئینہ گر حقیقت میں عمر خیام کے کوزہ گر سے کہیں زیادہ خالق کے لقب کا مستحق ہے جو گلخن میں مخشوش ریگ کو رفتہ رفتہ تربیت سے مصفا کر دیتا ہے اور آبگینہ سے آتشیں شیشہ بنا دیتا ہے۔ جب گرم شیشہ آتشکدہ سے باہر آتا ہے رقیق حالت میں ہوتا ہے اس وقت آئینہ ساز اپنے "دم" سے جو صورت چاہتا ہے شیشہ کو عطا کرتا ہے اگر کسی پہلو آگ کی تپش اعتدال سے ذرا بھی زیادہ ہو جاتی ہے تو شیشہ گلا جاتا ہے اور اپنی صورت چھوڑ دیتا ہے۔ مرزا شراب کو رنگ اور تاثیر کے لحاظ سے آتشِ گلخن کا مقابل بیان کرتے ہیں اور نشے کی حدت اور شدت کو یوں ظاہر کرتے ہیں کہ ساغر کو گداختہ بے بےصورت کر دیتی ہے پھر کہتے ہیں کہ یہی حالت میرے دل کی ہے جو فکر و اندیشہ کی آگ

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرۂ خوں وہ بھی

(۵)

سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی

کہنہ اور زوال رسیدہ عمارات میں آب و ہوا کے مدام اور پیہم اثر سے سنگِ سفید اور سنگ موسیٰ کے ریختہ مربعات پر کائی جم جاتی ہے اور بعض اوقات دیواروں سے پانی رسنے لگتا ہے۔ سیاہ و سفید شکستہ مرمر کی بالائی خشت سے قطرہ قطرہ آب گرتا رہتا ہے قطرے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے آتے ہیں اور جو سب سے آگے ہوتا ہے وہ مقام مقررہ پر پہنچ کر چشم زدن توقف کے بعد گر پڑتا ہے جو چیز قطرہ کو فوراً گر پڑنے سے روکتی ہے وہ پانی کے سالمات کا باہم ملحق ہونا ہے۔ لیکن کہاں ایک قطرہ کی قوت قرار کہاں تمام کرۂ ارض کی کشش ثقل قطرہ کیا تاب لاسکتا ہے مرزا غالب اپنے دل کا ٹپکتے ہوئے قطرہ سے مقابلہ کرتے ہیں۔ انسان کے دل کو اطباء فرنگ نے ناسپاتی سے تشبیہ دی ہے لیکن درخت میں آویزاں ناسپاتی کا بالائی حصہ خورد اور زیریں حصہ کلاں ہوتا ہے اور دل کی حالت اس کے خلاف ہے دل کی کوئی تشبیہ خوں کے ٹپکتے ہوئے قطرے سے بہتر ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں دل کی لاچاری اور عاجزی کی کیا تصویر ہے۔

آگ پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا

(۶)

ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

جو لوگ علم مناظر و مرایا سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر کسی ذرہ کو کسی وزن میں آنکھ لگا کر دیکھا جائے تو ذرہ کے بے مقدار جسم سے ہر سمت شعاعیں نکلتی ہوئی نظر آتی ہیں اس کا باعث آفتاب کی روشنی ہے جس کے عکس سے ذرہ کا جسم خارجاً روشن ہو جاتا ہے یہ شعاعیں بعینہٖ ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا پھلجھڑی چھوٹ رہی ہے۔ مرزا غالب اس کو ذرہ کا پرافشاں ہونا کہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مرزا کے وقت میں تو کیا اس زمانہ میں بھی جبکہ انکسار اور انعکاس کے مسائل زبان زد عام ہیں کتنے اشخاص ایسے ہیں جو اس کیفیت سے واقف ہیں۔

ایک اور معنی اس شعر کے ممکن ہیں۔ مرزا نے بعض اوقات پرافشانی کو پرزنی کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً

کروں بیداد ذوق پرفشانی عرض کیا قدرت
کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی (۵)

اگر یہاں بھی یہی معنی ہیں تو ذرات کی پرواز مراد ہے۔ چنانچہ ایام گرما میں دوپہر کے وقت تاریک کمرے میں اگر کوئی آفتاب کی کرن سیاہ پوش روشندان کے کسی رخنہ سے اندر آجاتی ہے تو غبار کے باریک ذرے جو خط شعاع سے روشن ہو جاتے ہیں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

جب کاغذ کو آگ میں ڈالا جاتا ہے تو ذرا سی دیر آتش بلند ہو کر شعلہ بجھ جاتا ہے اور سرخ و سیاہ رنگ کا کاغذ کا نیم جان جسم رہ جاتا ہے جس میں سکرات اور نزع کی تمام علامات نظر آتی ہیں۔ پھر یہ ارتعاش حیات بھی فرو ہو جاتا ہے اور سراپا جل چکنے کے بعد ہزاروں نقطہ ہائے روشن کاغذ پر نمودار ہو جاتے ہیں آخر کار کاغذ خاکستر ہو جاتا ہے۔

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
(۳)
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

جو شہر دریاؤں کے کنارے واقع ہوتے ہیں بعض اوقات شدتِ آب کی وجہ سے غرقِ سیلاب ہو جاتے ہیں مثلاً حیدرآباد اور لکھنؤ کے واقعات سب کو یاد ہیں جب آبِ دریا طغیانی کے ساتھ شارعات سے مکانات میں داخل ہوتا ہے تو جہاں سے راہ پاتا ہے در آتا چلا جاتا ہے۔ جہاں داخل ہونے میں مزاحمت ہوتی ہے پانی کف لے آتا ہے جب جوشِ دریا فرو ہو چکتا ہے تو سطحِ آب پھر نیچی ہو جاتی ہے اور پانی واپس دریا کی جانب رواں ہو جاتا ہے لیکن کفِ سیلاب جس جس جوف اور سوراخ میں پیدا ہوا تھا وہیں باقی رہ جاتا ہے اور تارِ عنکبوت کی طرح اس رخنہ کو بند کر دیتا ہے۔

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
(۴)
پرافشاں جوہر آئینہ میں مثلِ ذرہ روزن میں

تارے توڑنے کے لئے دراز کر رہا ہے جن مظاہر قدرت کو مزاد سمجھتے ہیں۔ اور شعرا یا تو اُن کو عام خیال کر کے اُن پر غور ہی نہیں کرتے یا ان میں اس درجہ شعریت نہیں پاتے کہ اُن کی کیفیت کو اپنے کلام میں بیان کریں اور اگر کرتے ہیں تو کامیاب نہیں ہوتے مثلاً

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
(۱)
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

کون ہے جس نے شمع کو گل ہوتے نہیں دیکھا لیکن کسی شاعر نے مشاہدہ کیا ہے کہ شعلہ کے ختم ہو جانے کے بعد دیر تک فتیلہ سے دھواں اُٹھتا رہتا ہے عاشق کی موت کی اس سے بہتر کیا تمثیل ہو سکتی ہے

برنگِ کاغذِ آتش زدہ ہم رنگ بیتابی
(۲)
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

حروف آشنا کاغذ گویا بلکہ زندہ ہوتا ہے کاغذ چونکہ کلام ربی اور کلمات بشری کا حامل ہے۔ کاغذ کے جلانے کو عیب خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن کاغذ کی تحریر مستقل سند ہوتی ہے اس لئے شہادت کو تلف کرنے کے لئے کاغذ کا ضائع کرنا بسا اوقات لازمی ہو جاتا ہے۔ معشوق ابتدا سے نامہائے عشاق کو جلاتے آئے ہیں لیکن کسی شاعر کے مشاہدہ میں یہ نہ آیا کہ کاغذ کے جلنے میں کیا شاعرانہ کیفیات نہاں بلکہ عیاں ہیں

(۹)

قدرت مستور حقیقت ہے۔ قدرت اور عوام کے درمیان ایک دیوا حائل ہے جس میں سے صرف شاعر کی نظروں کی التفات شعاعیں گذر پاتی ہیں۔

مرزا غالب کی چشم بینا قدرت کو تمام نقاط نگاہ سے دیکھتی ہے اور ہر نظر میں ایک نیا جلوہ پاتی ہے۔ جو شعرا قدرت کے ترجمان ہیں ان میں سے اکثر سعدی اور ورڈس ورتھ (Words worth) کی طرح قدرت سے تماشائے بہار و خزاں باغ و راغ کہسار و آبشار مراد لیتے ہیں۔ غالب کے مشاہدات کنار دریا، دامن کوہ لب جوئے بہت کم متعلق ہیں۔ مرزا کا جی لب دریا خاموش مرغزاروں سے زیادہ شہروں کے پرشور کوچوں میں لگتا ہے۔ جہاں زندگی شعاع منتشر کی طرح ہفت رنگ جلوہ دکھاتی ہے۔ مرزا کے نزدیک دلی کی گلیوں کی رونق یا ویرانی، خوش وقتی یا افسردگی شورش یا خاموشی خود اُن کے اپنے احساسات کی خارجی تصویریں ہیں جو صورتیں اِدھر اُدھر رواں دواں نظر آتی ہیں وہ مرزا کے نزدیک ان کے اپنے خیالات کے مجسمات ہیں۔ اُن کو القا کے لئے سرو جوئبار کو شب ماہ لب آب صحبت یاریں با ساغر و نے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اگر کسی بنی ہوئی عمارت پر نصب شدہ زنجیر فیل کا آہنی حلقہ بھی رتی میں آویزاں دیکھتے ہیں تو اُن کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سیمرغ اپنا چنگل آسمان سے

لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

حضرت یعقوب کی آنکھیں فرزند کے فراق میں روتے روتے سفید ہو گئیں تھیں مرزا کی فکرِ رسا نے اِس سے تاثیرِ عشق کا کیا طرفہ مضمون پیدا کیا ہے کہ وہ روزن جو دیوارِ زندانِ یوسف میں ہیں حضرت یعقوب کی نابینا آنکھیں ہیں جو اپنے فرزند کو دیکھتی رہتی ہیں سفید نابینا آنکھوں کو جو روزن سے مشابہت ہے ظاہر ہے۔ قطرہ قطرہ پانی اگر گرتا رہتا ہے تو مرمر اور فولاد تک میں سوراخ کر دیتا ہے۔ حضرت یعقوب کی مدام اشکباری سے دیوارِ زنداں میں سوراخ ہو گئے ہیں جس طرح روزنِ دیوار کبھی بند نہیں ہوتے حضرت یعقوب کی نابینا آنکھیں بند نہیں ہوتیں۔ رات دن بخوابِ جانبِ یوسف نگراں رہتی ہیں حضرت یعقوب کی آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں تا کہ تاریکی اور حبس سے یوسف کا دم خفا نہ ہو آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں تا کہ یوسف زنداں سے دنیا کا تماشا دیکھ سکیں اور تنہائی سے پریشان نہ ہوں۔

بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس

(۱۱)

از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

حیات بعد الممات اور بقائے روح کی کیا عجیب مثال دی ہے

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
(۸)
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

دنیا کی تکالیف علائق سے ہیں جو اضافت اور نسبت سے بری ہیں وہ الم سے بھی سبکدوش ہیں۔ آزاد و ظاہر ہیں سب سے زیادہ آزار پاتے اور رنج اُٹھاتے ہیں اور شب و روز تاریک ماتم خانہ میں رہتے ہیں لیکن واقعاً غم کا اثر ان پر عارضی اور فوری ہوتا ہے مرزا اپنی اس سکون طبیعت کی کیا فوق الخیال مثال دیتے ہیں کہ جب برق بلا گرتی ہے تو ہم بجائے خوف زدہ اور پریشان ہونے کے کمال اطمینان سے اٹھ کر جوالہ برق سے اپنے الم کدہ کی خاموش گشتہ شمع کو روشن کر لیتے ہیں۔

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
(۹)
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

دشتِ وفا میں عشق کی تگ و دو کا انجام موت ہے اس بحر سراب کا کوئی ساحل نہیں کوئی جادہ نہیں جس سے مسافر صحرا ہے جان سلامت لے جاسکے۔ راہِ عدم کو مرزا کمال شاعری سے یوں بیان کرتے ہیں کہ صرف ایک راستہ ہے اور وہ نگہِ دیدۂ تصویر ہے یعنی کوئی راستہ نہیں کیا خوب عدم کو وجود کے لباس میں جلوہ گر کیا ہے۔

(۱۰)
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر

جوشش شباب سے سبزے تیرہ گوں سبز ہو گئے ہیں گویا سرمست رندانِ چمن وجد میں ہیں تمام باغ پر سرور کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا اُسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیاباں پہ نشہ کا سا عالم گلستاں پر (میرحسن)

مرزا کہتے ہیں کہ یہ کیفیت ہے کہ نم بارش آلودہ ہوا خوشہ انگور کے رس کو لطیف شراب بنا دیتی ہے

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر (۷)

جب زلیخا نے یوسف سے اپنا مقصودِ دل نہ پایا تو عزیز سے کہکر زنداں میں بھیجدیا یہ زلیخا کی آخری کوشش تھی کہ شاید وہ در بالکلیت قید سے مان جائے لیکن ادھر یوسف داخل ہوا اُدھر داروغہ کو فرمان ہوا کہ محبس کی آرائش میں مشغول ہو تاکہ وہ نازنین قید سے زیادہ ملول نہ ہو

معطر دار دیوار و درش را
منور ساز طاق و منظرش را

چنانچہ معمار حجرۂ یوسف میں سفیدی میں مشغول ہیں۔ مرزا کا خیال کہاں سے کہاں منتقل ہوتا ہے ان کو یہ سفیدی دیدۂ یعقوب کی نابینا آنکھوں کی سفیدی معلوم ہوتی ہے

پدرش نگرانست کہ یوسف بہ زندان است

اَلَا اَیُّھَا الْقَلْبُ الَّذِیْ اللّٰہِ نُجُّ عامًا
وَلِیْدًا بِلَیْلیٰ لَمْ تَقْطَعْ تَمَائِمَہٗ

میں لیلیٰ کے عشق کے بھنور میں اسی وقت پھنس گیا تھا جبکہ بچہ تھا اور میری گلے کے تعویذ بھی نہ کٹے تھے۔ ایک روایت ہے کہ منصور کو انا الحق کہنے کے باعث لوگ خشت و سنگ سے سرزنش کیا کرتے تھے۔ ایک شبلیؒ کا بھی ادھر سے گذر ہوا شبلی نے شاید ازراہ مزاح ایک پھول منصور کی جانب پھینک دیا منصور کو نہایت درجہ ملال ہوا کیونکہ شبلی جو خود عاشقانِ خدا میں سے تھے منصور کے معاملہ سے واقف تھے۔ ضرور ہے کہ جب مرزا نے مجنوں پر پتھر اٹھایا ہوگا تو مجنوں نے شکایتاً مرزا کی طرف دیکھا ہوگا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
(۵)
پُر گلِ خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

عاشق کے مقتل کو جانے کی مسرت کا اندازہ ممکن نہیں دامن نگاہ یعنی بھر جاکہ گئی تمام افق زخموں کے خیال کی بہار سے پرگل ہے یہ گلزار عاشق گلزار خلیل اللہ سے کم نہیں۔

پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن
(۶)
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

موسم باراں میں ابر و ہوا کا زور ہے باغ سے تا باغبان سب شور بور ہیں درخت

عاشق سفرِ عشق میں اس درجہ خستہ جان اور مضمحل ہو گیا ہے کہ قدم قدم پر ضعف سے لغزش ہوتی ہے اور آگے بڑھنے کا یارا نہیں۔ اس دنے مضمون کو وسعت تخیل اس طرح پر ادا کرتا ہے کہ جس طرح تشنہ لب مسافر کو دشت میں سراب دریائے آب معلوم ہوتا ہے ٹھیک یونہی اور مجروح بدن عاشق کو اپنے سایہ پر خوابگاہ منزل کا گمان ہوتا ہے۔ ہر لحظہ خیال کرتا ہے کہ مقامِ مقصود کو پا لیا اور ہر لحظہ چونکتا ہے کہ نہیں ہنوز دشتِ ناپید اکنار کے مین وسط میں ہے۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا (۴)

کہتے ہیں کہ جب مجنوں کا شباب عشق تھا میرا وقتِ طفلی تھا تمام شہر کے بچے مجنوں کو پتھروں سے مارا کرتے تھے کہ اقتضائے بچپن ہو میں نے بھی ایک بار دیگر ہم عمروں کی طرح اس ستم زدہ کو نشانۂ سنگ بنانے کی غرض سے پتھر اٹھایا۔ دم زدن میں اپنی تمام آئندہ زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میں آگے آگے ہوں اور اطفالِ شہر پیچھے پیچھے خشت و سنگ کی بارش کر رہے ہیں یعنی سرشتِ عشق طفلی کی ناسمجھی سے آزاد تھا گو لڑکپن کا زمانہ تھا لیکن پہلی ہی کجروی پر ضمیر عاشقی نے متنبہ کر دیا۔

جس طرح نبوت لبطنِ مادر سے شروع ہوتی ہے عشق بھی عہدِ طفلی سے آغاز ہوتا ہے چنانچہ خود مجنوں کا قول اسکا مصداق ہے۔

وفا جو ایک صفتِ قلبی ہے شاعر کو خار جا دشت کی صورت میں نظر آتی ہے اور دشت بھی بے آب۔ ہر جانب جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے ریگِ رواں ہے اور سراب کے ذرات جوہرِ تیغِ آبدار کی طرح تمازتِ آفتاب میں لرزاں ہیں۔ مقامِ لق و دق کی صحرا نوردی کا نام عشق ہے۔

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا
(۲)
بے تکلف داغِ مہ مہرِ دہاں ہو جائیگا

عاشق چاند کو دیکھتا ہے۔ چاند کے مشاہدہ سے معاً یہ خیال اُسکے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ اگر میں نے رازِ اُلفت اور دردِ فرقت کو اور چھپایا تو میں دیوانہ ہو جاؤنگا اور کوئی اتنا بھی تو نہ جانے گا کہ میرے جنون کا باعث کیا ہے۔ میرے غمخواروں اور میرے محبوب تک کو خبر نہ ہوگی۔ گویا یہ ماہتاب جس کی روشنی میرے قلب میں ماہِ نایاب کا تلاطم پیدا کر رہی ہے میرے لئے مُہرِ دہاں ہو جائے گا۔ روز روز تقریباً غروبِ ماہتاب کی کیفیت شاید دستار ہو کر کہتا ہے

"O Mercy to myself" I said

"If lucy should be dead"

(۳) سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی

ہر قدم سایہ کو اپنے میں شبستاں سمجھا

(۸)

اقبال نے مرزا غالب کی شان میں کہا ہے

فکرِ انساں کو تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تصور کی رسائی تا کجا!

کتابِ قدرت ایک تاریک کتاب ہے جس کے اوراق پر سوائے شعراء کے کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا اس ضیا میں ہر شے ایک نئی صورت او کیفیت میں مشاہدہ ہوتی ہے۔ لیکن روشنی شعلۂ برق کی مثال دم زدن میں غائب ہو جاتی ہے اور پھر وہی ظلمت چھا جاتی ہے۔ اِس روشنی میں ہر رگِ سنگ میں خونِ شیداں اور ہر شرارِ سنگ میں جلوۂ یزداں نظر آتا ہے۔ یہ کوئی شاعرانہ دروغ یا فریبِ نظر نہیں بلکہ شاہدِ حقیقت ہے۔

جب شعراء گرد و پیش کے مناظر اور واقعات کو دور از کار اور فوق الفطرت طور پر بیان کرتے ہیں تو وہ بیان اُن کے عینی اور یقینی نظارہ پر مبنی ہوتا ہے۔

وہ تمام نقاد شاعر ہیں جو محض الفاظ کے پس و پیش سے تمثیلات تیار کرتے ہیں اور نابینا ہونے کے باعث خود اُس کو نہیں دیکھ سکتے۔

(۱) موجِ سراب دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع

(۱۰)

راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے

(۱۱)

آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو

(۱۲)

حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی

(۱۳)

منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر

(۱۴)

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال

(۱۵)

کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گذر ہے کیا کہیے

اگر وہ مرقع ساز جو عشق و محبت کے معاملات کے نئے نئے مضامین کے متلاشی رہتے ہیں مندرجہ بالا اشعار کو لوحِ قرطاس سے پردۂ تصویر پر منتقل کریں تو ان میں سے ہر ایک ایک یادگارِ زمانہ تصویر ہو۔ مرزا کا قلم مو قلم ہے۔

مرزا غالب نے اپنے شعر میں دوگونہ لطف پیدا کیا ہے پہلے مصرعہ میں کہتے ہیں کہ نشہ کا بہانہ کرکے ہم سے لپٹ جاؤ کوئی یہ نہ جانے گا کہ تمہاری آرزو سے ایسا ہوا ہے دوسرے مصرعہ میں کہتے ہیں کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں خود نشہ کا بہانہ کرکے پیش قدمی کرونگا اور پھر خواہ تم کچھ بھی کہو سب مجھے معذور رکھیں گے۔

نیند اس کی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں

(۹) تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہو گئیں

اس شعر کو پڑھتے ہی مجنوں بنی عامر کے آخری کلام کا مضمون یاد آجاتا ہے البتہ جو درد اور گداز اس وارفتہ کے اشعار میں ہے۔ وہ اس میں نہیں۔

بِرَبِّکَ ہَل ضَمَمتَ اِلَیکَ لَیلٰی

قُبَیلَ الصُّبحِ اَو قَبَّلتَ فَاہَا

وَہَل رَفَّت عَلَیکَ قُرُونُ لَیلٰی

رَفِیفَ الاُقحُوَانَۃِ فِی نَدَاہَا

تجھے خدا کی قسم ہے کیا صبح کے پہلے تو نے لیلیٰ کو سینہ سے لگایا ہے یا اسکے منہ پر بوسہ دیا ہے۔ کیا تیرے اوپر لیلی کی زلفیں لہرائی ہیں جس طرح کہ گل بابونہ لہراتا ہے۔

ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا

یار محو خواب ہے اور عاشق پابوسی کے لئے جھکنا چاہتا ہے لیکن اس خیال سے کہ ممکن الامر اگر معشوق بیدار ہوگیا تو تمام عمر کے لئے اعتبار جاتا رہیگا۔ باز رہتا ہے عقل و شوق، اندیشہ اور آرزو کے کیا متضاد و تقاضات ہیں۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
(۵)
یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
(۶)
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
(۷)
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
(۸)
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھکر عذر مستی ایک دن

امیر خسرو کا ایک شعر ہے۔

جاناں اگر بہ شب دہ بنجر دہن خم
خود را بجواب سازم و گوئیم ہاں کیست

میں مشغول ہوتا ہے اور سر کی تحریر او رقشقہ کی لکیر تک نہیں بھولتا پھر گردن کے اُتار اور سینہ کے اُبھار کے خطوط کی کشش سے پیکر طیار کرتا ہے اور اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دستِ حنائی میں جو پردہ ہے وہ بھی اور جس غرفہ میں وہ پردہ آویزاں ہے اُس کو بھی دکھلاتا ہے۔

کہیں کہیں روزمرہ تصاویر کا دوسرا رُخ دکھایا ہے یعنی واقعات حقیقت اور قدرت کے مطابق ہیں لیکن امید اور عادت کے خلاف ہیں مثلاً

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے

(۲)

صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

وہ صنم جو عشق کو جنون کہتا تھا جو حسن کے اثر کا منکر تھا اور ہر عاشق و معشوق سے رم کرتا تھا اپنے جمال کے ایک جلوہ سے کیا حیران ہے۔ یار کے آئینہ کی جانب بے پرواہ بشاش بڑھنے اپنی صورت سے دوچار ہونے اور "نرگس" کی طرح تیر عشق کا نشانہ ہو کر بے اختیار پیچھے ہٹنے کا کیا صادق عکس ہے۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں

(۳)

عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

دے تو لوں سوتے میں اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر

(۴)

(۷)

بعض کا خیال ہے کہ شاعری مصوری ہے۔ اس پہلو سے بھی دیوان غالب عدیم المثال ہے ہر ورق پر ایسے اشعار موجود ہیں جن کو صفحۂ قرطاس سے جامۂ تصویر پر منتقل کیا جا سکتا ہے۔

شعر کو تصویر پر ترجیح ہے کہ تصویر ساکن اور شعر متحرک ہے۔ تصویر اپنے قایم کردہ انداز کو نہیں بدل سکتی۔ شعر ایک کیفیت کی مختلف حرکات کو ظاہر کرنیکی قدرت رکھتا ہے۔ تصویر رقبۂ حیات پر ایک نقطہ ہے۔ شعر ایک دائرہ ہے۔

حسن و عشق کے تمام معاملات کو مرزا نے اس خوبی سے نظم کیا ہے کہ ہو بہو تصویر نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔ اس کے لئے صرف زبان پر قدرت ہونا کافی نہیں بلکہ فطرت کا بڑا نکتہ داں ہونا ضروری ہے۔ کیا خوب زندگی کی روزمرہ تصویریں ہیں مثلاً کہتے ہیں

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
(۱)
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

تصویر گوش آشنا ہوتے ہی اول در دنداں اور لب مرجاں کا خاکہ کھنچتا ہے۔ پھر ہنسی کی آواہٹ اور پان کی سرخی سے ان میں تبسم کا رنگ بھرتا ہے۔ پھر رونمائی

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
(۴)
قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں

اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سرو قامت سے فتنۂ قیامت کم ہے اور دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ چونکہ تیرا قد ائمی ہی سے بنایا گیا ہے اس لئے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہے۔

سر اُڑانے کے جو وعدہ کو مکرر چاہا
(۵)
ہنسکے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہمکو

اس جملہ کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہم ضرور سر اُڑائیں گے دوسرے یہ کہ ہم کو تیرے سر کی قسم ہے یعنی ہم تیرا سر کبھی نہ اُڑائیں گے۔

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
(۶)
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تمکو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو۔

یاد آتا ہے وہیں یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم تو گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی لیکن دشت بھی اتنا ویران ہے کہ اُس کے دیکھنے سے گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
(۲)
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ میرے مرنے کے بعد شرابِ عشق کا کوئی خریدار نہیں اور ساقی یعنی معشوق کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے لطیف معنی یہ پنہاں ہیں کہ ساقی مصرعہ اولیٰ کو مکرر پڑھتا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں یعنی کوئی ہے جو مئے مرد افگن عشق کا حریف ہو۔ پھر جب اُس کی آواز پر کوئی نہیں آتا تو اُسی مصرعہ کو مایوسی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ یعنی کوئی نہیں۔

کیونکر اُس بت سے رکھوں جان عزیز
(۳)
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر میں اُس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لیگا اس لئے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اُس بت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے پھر اُس سے جان کیونکر عزیز رکھی جا سکتی ہے۔

جلا دی جائیں تو شعر کا ذرا بھی نقصان نہیں۔

صنائع اور بدائع کے استعمال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طبیعت میں آمد نہیں ہے۔ صنائع اور بدائع کا استعمال کلام کو عام ادبی زندگی سے جدا کر دیتا ہے۔ اور جس زمانہ میں صنائع اور بدائع کا عام رواج ہو وہ زمانہ اقوام کے انحطاط اور زوال کا ہوتا ہے۔ غالب بہت کم صنائع اور بدائع کا استعمال کرتے ہیں اُن کے کلام کے اشکال کا باعث فارسیت کا غلبہ الفاظ کا ادق ہونا اور ترتیب کا پس و پیش ہونا ہے اُس میں صنائع اور بدائع کی مشکلات کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔

لیکن ایک خصوصیت اُن کے کلام میں ایسی ہے جس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود نہیں ہے۔ جسطرح سفید رنگ میں تمام آفتابی الوان مضمر ہیں اُن کے بعض اشعار کی سادگی میں عجیب و غریب لطیف معنی پنہاں ہیں جیسے کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا۔ مولانا حالی نے مرزا غالب کے کلام میں اس نئی دنیا کا پتہ لگایا ہے اور حقیقت میں مولانا حالی مرزا غالب سے کچھ کم مستحق داد نہیں ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ؛
(۱) دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا!

جہاں اس کے یہ معنی ہیں کہ دشت اسقدر ویران ہے کہ خوف سے گھر

مولانا شبلی نے صنائع اور بدائع کے متعلق بحث کرتے ہوئے بجا کہا ہے
کہ ان کا نتیجہ شاعروں کے لئے کوہ کندن اور کاہ برآوردن سے زیادہ نہیں کلام
جس قدر صنائع اور بدائع کے استعمال کی زیادتی ہوگی اتنا ہی کلام حقیقت سے بعید
اور تصنع سے قریب ہوگا۔ خاموش اور کم مطلب اشعار محض آرائش کے قواعد سے
گویا اور پُر معنی نہیں بن سکتے۔ حسن قوانین کا پابند نہیں ہے بلکہ ہمہ قیود سے آزاد ہے
مارکو دل پینیو کے قواعد مصوری کی رو سے عورت کا بدن تصویر کے
خاکہ میں ایک خط منحنی کو ایک اور تین میں حسابی قاعدہ سے ضرب دینے سے قایم
ہوتا ہے۔ بھلا کہیں بے جان لکیریں نسوانی جسم کی شعریت کو وجود میں لا سکتی ہیں۔ بعض
تصویر نگار مختلف رنگوں میں مختلف معنی بیان کرتے ہیں۔ افلاطون کے پیرو کہتے ہیں
کہ حسن روح میں ہے۔ ارسطو کے متبعین مخالفت کرتے ہیں کہ جسم میں ہے۔ لیکن
درحقیقت نہ پیکر معشوق میں کوئی معین خطوط ہیں نہ کسی رنگ میں کوئی خاص مناسبت
ہے۔ خوبی نہ روح سے متعلق ہے نہ جسم سے محدود ہے حسن حسن میں ہے جس کی آفرینش
شعرا کا کام اور راز ہے جس طرح اقلیدس خطوط سے خوبصورت سراپا نہیں بن سکتا
صنائع اور بدائع سے خوب کلام ترتیب نہیں پا سکتا۔ قابل عزت ہیں وہ تمام
فضلا جنہوں نے علم صنائع اور بدائع کو فروغ دیا ہے۔ لیکن اگر ان کی تمام کتابیں

ہیں طلطیان (Titian) کے رنگوں میں بھی وہی سکون ہے جو اس کی جنبشِ موقلم
میں ہے۔ اور گاگین (Gauguin) کے رنگوں میں بھی وہی ہیجان ہے جو ارتعاش
اس کے تخیل میں ہے۔ مرزا نے خود آفریدہ تشبیہات اور استعارات کا اس بے تکلف
انداز سے استعمال کیا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے گویا یہ ہمیشہ سے ہماری زبان میں موجود
تھے اور ہزار بار کے سنے ہوئے ہیں۔

واہ رے تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چنانچہ کس خوبی سے موئے آتش دیدہ کو زنجیر سے۔ دانہ ہائے تسبیح کو
صد دلِ عشاق سے۔ خانۂ مجنوں کو گردِ بے دروازے سے۔ بہار کو حنائے پائے خزاں
سے۔ جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل سے۔ حضرت یعقوب کی نابینا آنکھوں کو روزنِ دیوارِ
زندانِ یوسف سے۔ دامِ موج کو حلقۂ صد کامِ نہنگ سے۔ تارِ اشکِ یاس کو رشتۂ
چشمِ سوزن سے۔ ہر قطرۂ خونِ تن کو نگینِ نامِ معشوق سے دریا کو زمین کو عرقِ انفعال سے
سرمہ کو دودِ شعلۂ آواز سے۔ نالہ کو گردشِ سیارہ کی صدا سے۔ صبحِ وطن کو خندۂ دنداں نما سے
موئے شیشہ کو دیدۂ ساغر کی مژگاں سے۔ آئینہ کو ورطے سے۔ موجِ شراب کو مژۂ خوابناک
سے۔ ساغر کو مشتِ دستِ گداں سے وھو ہذا امثال بیان کیا ہے۔

تصویر اکثر تکمیل حیات کو نہیں پہنچتی۔ اور بے رنگ رہجاتی ہے۔ تشبیہ یا استعارہ کا تیسرا کام اختصار اور بلاغت پیدا کرنا ہے جو بات دو لفظوں میں ادا ہوتی ہے دوسری طرح دو سطروں میں بیان نہیں ہو سکتی۔

اُردو شاعری میں جو تشبیہات اور استعارات قدیم ہیں اور جو دورِ دیدہ چلے آتے ہیں انکو اصول مسلہ خیال کیا جاتا ہے اور شعرا اُن سے بال برابر تجاوز کرنا گناہ خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ بقول مولانا حالی معشوق کی صورت کو چاند، سورج یا جنت سے۔ آنکھ کو نرگس یا دام یا بیمار سے ابرو کو کمان یا محراب سے مژہ کو تیر سے لبوں کو نبات یا آبحیات سے۔ منہ کو غنچہ سے کمر کو بال سے اور دونوں کو عدم سے مشابہ قرار دینا مخصوص اور لازم ہو گیا ہے۔

مرزا نے خود کو اس تنگ دائرہ میں مقید نہیں کیا جس طرح ہر زمانہ کی تصویروں کا رنگ و روغن علیحدہ ہونا بہ تقاضائے وقت لازمی ہے۔ ہر زمانہ کی تشبیہات اور استعارات کا جدا ہونا بھی ضروری ہے۔

صاحب نظر ایک نگاہ میں محض رنگ سے بتا سکتے ہیں کہ تصویر مصر کے عہد اولیں سے ہندوستان کے عہد اجنتا سے یا فرنگ کے قرون وسطیٰ سے یا اطالیہ کے زمانہ احیا سے متعلق ہے۔ ہر عہد کے مصور اپنا رنگ بھی اپنے ہمراہ لاتے

علم الالوان کا جاننا لازمی ہے۔ لیکن گاہ گاہ ایک ایسا آتش نفس مغنی مانی قلم مصور پیدا ہوتا ہے جو بلا تعلیم اپنے زمانہ کا مجتہد ہوتا ہے۔ بعینہٖ کبھی کبھی ایک ایسا پیغمبر سخن دنیا میں آتا ہے جو نظریات اور قواعد زبان سے آزاد اور صرف روح القدس کا ترجمان ہوتا ہے۔

شیکسپیر اور غالب کا کام قواعد زبان کی پابندی نہیں ہے۔ قواعد زبان کا کام ہے کہ اُن کی پابندی کرے۔ یا اُن کی خاطر اپنی درسیات میں خاص ضمیمہ جات کا اضافہ کرے۔

(۶)

جہاں مرزا نے الفاظ میں نادر اور شستہ تصرفات سے کام لیا ہے وہیں تشبیہات اور استعارات میں بھی عام پابندی سے گریز کیا ہے۔ تشبیہات اور استعارات کی بنیاد قیاس پر قایم ہے۔ تشبیہ یا استعارہ کا پہلا کام معنی آفرینی ہے۔ کسی امر کو کتنا ہی واضح بیان کیا جائے ذہن مفہوم کے پانے سے قاصر رہتا ہے لیکن ایک شبیہ مثال کام دیجاتی ہے۔ بہت سے دشوار اور غریب اشعار حل نہیں ہوتے لیکن ایک مقابل شعر فوراً مضمون کو آئینہ بنا دیتا ہے۔ تشبیہ یا استعارہ کا دوسرا کام حسن آفرینی ہے تشبیہات اور استعارات تصویر نظم کے بوقلمون الوان ہیں جن کی آمیزش بغیر

جیب خیال۔ دعوتِ مژگاں۔

ان الفاظ کی جدت آشکار اور خوبیاں ظاہر ہیں۔ بہت سے نکات ضرور قابلِ بیان ہیں لیکن ان کی اس تمہید میں گنجائش نہیں۔

میکائیل آنجلو (MICHAEL ANGELO) کا قول ہے کہ مجسمہ ساز بت کو مرمر تراش کر نہیں بناتا۔ بلکہ حقیقت میں بت ابتدا ہی سے سنگِ سفید میں موجود اور جلوہ نمائی کا منتظر اور متقاضی ہوتا ہے۔ استادِ کامل محض پتھر کی عارضی چادر کو علیحدہ کر دیتا ہے۔ یہی حالت مرزا کے ساختہ الفاظ کی ہے وہ ساختہ نہیں بلکہ ورجل (VERGIL) کی مثال آفریدہ ہیں۔

مرزا غالب نے بعض اوقات قواعد کے خلاف زبان لکھی ہے اسکے متعلق فضیل الحسن حسرت اور علی حیدر طباطبائی نے چند مناسب اور معقول اعتراضات کئے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ قواعد منطق کا خارجی پہلو ہے اور شاعری منطق سے آزاد ہے علم القواعد کا کام تقریر اور تحریر میں صحت پیدا کرنا ہے کلام میں لطافت پیدا کرنا نہیں۔ اسلئے بعض اوقات شاعر کو اپنے جذبات کے کامل اظہار کے لئے قیود سے آزادی حاصل کرنا ضروری ہے۔

فنونِ لطیفہ میں موسیقی یا مصوری کی تحصیل کے لئے علم الاصوات اور

تو اُردو کے ذخیرۂ الفاظ کو بہت محدود پایا۔ لیکن قاعدہ ہے کہ جہاں نیا خیال پیدا ہوتا ہے وہاں نیا لفظ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر جان اپنا جسم خود ہمراہ لاتی ہے۔ مرزا کے خیالات نے اپنے اظہار کے لئے خود الفاظ تیار کر لئے بلکہ دقت نے مرزا کی مشکل پسند طبیعت کے لئے کام کو زیادہ آسان کر دیا۔ الفاظ سازی کے فن میں مرزا اجتہادِ کامل کا درجہ رکھتے ہیں چنانچہ یہ الفاظ ملاحظہ ہوں۔

دام شنیدن۔ خمارِ رسوم۔ آتشِ خاموش۔ جوہرِ اندیشہ۔ گلبانگِ تسلی۔ شبنمستاں۔ دریائے مے۔ پہلوئے اندیشہ۔ عرقِ نمکداں۔ خانہ زادِ زلف۔ زنجیرِ رسوائی۔ جمع و خرچ دریا۔ موجِ نگاہ۔ نبضِ خس۔ تشنۂ فریاد۔ خلوتِ ناموس۔ صیدِ زدام جستہ۔ خود داریٔ ساحل۔ شہپرِ رنگ۔ موجۂ گل۔ گذرگاہِ خیال۔ برگِ ادراک۔ طالعِ خاشاک۔ آئینۂ انتظار۔ خس جوہر۔ لذتِ سنگ۔ گردشِ رنگِ افشردۂ انگور۔ شہرِ آرزو۔ صحرا دستگاہ۔ دریا آشنا۔ محشرِ خیال۔ مژگانِ سوزن۔ مژگانِ یتیم۔ کنگرِ استغنا۔ سلکِ عافیت۔ معاشِ جنوں۔ دامِ تمنا۔ دریائے بیتابی۔ وادیٔ خیال۔ سیاست دریاں۔ نسیۂ نقدِ دو عالم۔ طلسمِ پیچ و تاب۔ طعنۂ نایافت۔ جنت نگاہ۔ فردوسِ گوش۔ کالبدِ دیوار۔ گلستانِ تسلی۔ چشمِ صحرا۔ شیرازۂ مژگاں۔ برخوردارِ بستر۔ رنگِ فروغ۔ دامانِ خیال۔ قلزمِ خوں۔ غبارِ وحشت۔ شرارِ جستہ۔

قائل ہیں۔ دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مرزا نے ایک لفظ کو جہاں تک ہو سکا ہے دوبارہ استعمال نہیں کیا۔ اس کی وجہ صہبان وائل کی طرح یہ نہیں ہے کہ وہ کسی لفظ کی تکرار نہیں کرتے بلکہ یہ ہے کہ وہ کسی خیال کا اعادہ نہیں کرتے۔

زبان ارتقا کی پابند ہے۔ الفاظ بیجان نہیں بلکہ زندہ ہیں گو منطق کے قواعد لاتبدیل ہیں لیکن تصورات بمرور وقت تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور چونکہ تصور کے زبان سے ادا کرنے کا نام ہی لفظ ہے۔ الفاظ بھی تغیر کا تقاضا رکھتے ہیں اگر تجدید عہد بہ عہد نہ ہوتی رہے تو زبان کہنہ اور پارینہ ہو جائے۔

زبان کی تجدید مذہبی یا تمدنی اصلاح سے آسان نہیں۔ جس طرح رواج غالب آتا مشکل ہے محاورہ کا مٹانا بھی مشکل ہے۔ بہت سے ادیب اس نکتہ سے غافل ہیں کہ خوب سے خوب محاورہ بلحاظ عمر آخر ضعیف ہو کر بے جان ہو جاتا ہے چنانچہ اردو میں اس وقت بہت سے محاورات ہیں جو حقیقت میں الفاظ اور فقرات "میان" ہیں۔ مرزا نے اپنے دیوان میں محاورہ کی بندش سے اکثر احتراز کیا ہے تمام دیوان میں مشکل سے دس اشعار ایسے ہیں جن میں کوئی محاورہ باندھا ہے۔ مرزا کی شاعری دلی کی گلیوں یا لکھنؤ کے کوچوں کی پابند نہیں بلکہ آزاد دائرہ زبان ہے۔ جب مرزا نے اپنے فلسفیانہ خیالات کے لئے موزوں الفاظ کی تلاش کی

اور اس بات پر اصرار نہ کرنا چاہیے کہ اُس کے پس پشت کیا ہے۔ لیکن بچے جب
آئینہ میں اپنا عکس دیکھکر حیران ہوتے ہیں تو نادانی سے پشتِ آئینہ کو بھی دیکھنے لگتے ہیں

(۵)

فنونِ لطیفہ میں خوش نگاری کو فنِ تعمیر سے سب سے زیادہ مشابہت ہے
الفاظ وہ خشت و گل، چوب اور آہن ہیں جن سے ادبیات کی عمارت عبارت
ہوتی ہے میر حسن دہلوی کی طرح اطالوی شاعر ارسٹو نے اپنے دیوان میں عجب گلکار
آئینہ بند، منور، اور پر عشرت، محلات طیار کیے ہیں۔ کسی نے اس سے دریافت کیا
کہ اے غریب کاشانہ نشین شاعر یہ ساز و سامان کہاں سے پایا۔ ارسٹو نے جواب
دیا الفاظ خشت و سنگ سے ارزاں ہیں۔

لیکن مرزا کے الفاظ لعل و جواہر سے بھی گراں ہیں مرزا غالب اس بات
سے خوب واقف ہیں کہ مترادفات کو محض مولفانِ لغت نے طلباء کی سہولت کی
غرض سے وضع کر لیا ہے ورنہ ایک معنی کے دو الفاظ کسی زبان میں نہیں ہیں توام
بچے کتنے ہی ہم صورت ہوں ان کو ایک دوسرے کی عارضی غیر حاضری میں بھی
ایک سمجھنا فاش غلطی ہے۔ مرزا الفاظ کے نازک سے نازک فرق کو خوب جانتے ہیں
وہ ادیبانِ فرانس کی طرح عقیدۂ (Maot Propre) کے پابند اور

ہوگئی ہے۔ فلسفہ چیز ہی ایسی ہے۔ فلابیر فرانسیسی ناول نگار کا قول ہے۔

"جب میں کانٹ اور ہیگل کو مطالعہ کے لئے اُٹھاتا ہوں تو سر میں

درد ہونے لگتا ہے۔"

یہی باعث ہے کہ

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

دیوانِ غالب میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کا مفہوم پانے سے ذہن مطلقاً قاصر ہے۔ تخیل عرصۂ امکان میں ہر جانب پرواز کے بعد مجبوراً واپس آجاتا ہے گویا ایک دائرہ ہے جس سے گریز ناممکن ہے۔ بہت سے نقاد اس کو "کیف شراب" پر محمول کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ گیٹے کے اعلیٰ ترین کلام پر جو فاؤسٹ حصۂ دوم میں ہے یہی اعتراض ہر جانب سے کیا گیا تھا۔ ایک دن ایکرمان نے گیٹے سے دریافت کیا کہ اس اشکال کا کیا باعث ہے؟

گیٹے نے جواب دیا یہی تاریکی ہی تو ہے جس پر لوگ فریفتہ ہیں۔ لوگ ان مقامات پر لاینحل مسائل کی مثال غور کرتے ہیں اور اپنی ناکامیابی سے نہیں اُکتاتے۔ انسانی طلب کی انتہا تحیر ہے اگر کسی فعل سے حیرت پیدا ہو تو وہ کمال فن کا

(۴)

زبان ارضی ہے، اور شاعرانہ خیالات سماوی ہیں ان دونوں کو ملا دینا گویا لطیف روح اور مکدر مادہ سے جسم طیار کرنا ہے شعرا گو تلامیذ الرحمٰن ہیں لیکن ان میں بھی یہ قدرت نہیں کہ اپنے خیالات کا کامل اظہار کر سکیں۔ جو خیالات دل میں موجزن ہوتے ہیں وہ اصلی لطافت کے بہت کچھ ضائع ہوئے بغیر روئے خیال سے روئے قرطاس تک نہیں آتے۔

اقبال نے اس احساس کو یوں بیان کیا ہے۔

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش — جس کے ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش
بربطِ کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار — جس کے ہر تار میں ہیں سیکڑوں نغموں کے مزار
محشرستانِ نوا کا ہے امیں جس کا سکوت — اور شرمندۂ ہنگامہ نہیں جس کا سکوت

آہ امید محبت کی بر آئی نہ کبھی!
چوٹ اس ساز نے مضراب کی کھائی نہ کبھی

غالب کی شاعری کے جسم پر زبان کا جامہ اسی وجہ سے تنگ ہے یہانتک کہ بعض جگہ سے چاک ہو گیا ہے۔ اور عریاں بدن اندر سے نظر آتا ہے۔

چونکہ مرزا غالب کا موضوعِ کلام بیشتر فلسفہ ہے یہ مشکل اور بھی زیادہ

شاعری کا دونوں پر خاتمہ ہو گیا ہے عمیق اور جدید خیالات حقیقت اور مجاز قدرت اور حیات کی کثرت ان کے دماغوں میں وحدت میں منتقل ہو کر وجود پاتی ہے دونوں اقلیم سخن کے شہنشاہ ہیں تہذیب، تمدن، تعلیم تربیت، فطرت کوئی زندگی کا ایسا پہلو نہیں جس پر دونوں کا اثر نہ پڑا ہو۔

گیٹے کو خود اُس کے زمانہ میں شہرت حاصل ہوئی۔ غالب اُن اہل کمال میں ہیں جن کو بقائے دوام کے کشور میں داخل ہونے کے لیے موت کے دروازہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ گیٹے کا کلام متعدد جلدوں میں ہے غالب کا دیوان علاوہ قصائد ورباعیات ۱۸۵ غزلوں سے جن میں ایک ہزار چار سو چھتیس اشعار ہیں زیادہ نہیں[1]۔

گیٹے کا کلام قومی اور ملکی ترقی کا باعث ہو چکا اور اپنا خاص منشا پورا کر چکا۔ غالب کا کلام اب مقبول ہوا ہے اور آئندہ نسلیں اس بات کا موازنہ کرینگی کہ اُن کی ترقی میں غالب کے کلام کا جزو اعظم کہاں تک ممد اور معاون ہوا ہے گیٹے کی نگاہ اشیاء کے خارجی پہلو سے گذر کر داخلی کیفیت تک پہنچی ہے۔ غالب کی نظر اندرونی کیفیت کے مشاہدہ سے بیرونی کیفیت کا قیاس کرتی ہے۔

[1] چونکہ یہ مقدمہ جدید قلمی نسخے کے ملنے سے پہلے لکھا جا چکا تھا، اس سبب اس تعداد میں صرف قدیم مطبوعہ دیوان کے شعر شمار کیے گئے ہیں۔

زنجیروں کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی ہیں کیا تعجب ہے اگر اس یورپ زدگی کے زمانہ میں طالب علم اور انگریزی تعلیم یافتہ مرزا غالب کا شیکسپیر ورڈس ورتھ اور ٹے نی سن سے مقابلہ کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ افسوس یہ کوتاہ نظر یہ نہیں جانتے کہ شاعری اور تنقید پر کیا دانستہ ظلم ہوتا ہے۔

صلاح الدین خدابخش نے غالب کا مقابلہ ہائن رش ہائی نے المانی شاعر سے کیا ہے۔ کہاں ہائن رش ہائی نے محض مغنی جو عشق والفت کے مضامین بصورت قطعات افسردگی کے ساتھ بیان کر کے خاموش ہو جاتا ہے۔ کہاں غالب جو دنیا کو اطلس کی مثال اپنے شانوں پر اُٹھائے ہوئے ہے اور جس کا سرِ دسیلۂ بسیارہ ہوتا ہوا فلک الافلاک تک پہنچتا ہے۔ مرزا غالب کا صحیح اندازہ قائم کرنا خود ایک بلند پایہ شاعر ہی کا کام تھا۔ اقبال نے بجا کہا ہے۔

آہ تو اُجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

دنیا میں اگر کسی شاعر سے غالب کا مقابلہ ہو سکتا ہے تو وہ شعرائے المانیہ کا سرتاج یوحنا ولف گانگ فان گیٹے المعروف بہ گیٹے ہے۔

غالب اور گیٹے دونوں کی ہستی انسانی تصور کی آخری حدود کا پتہ دیتی

ایسا شعر شیشۂ آئینہ کے جو گھن سے سالم اور درست باہر آئے لیکن صیقل سے محروم ہے

مرزا غالب کے لئے شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری ہے۔ یہی باعث ہے کہ دیوان کا ہر مصرعہ رباب نظر آتا ہے۔ اوزان رمل میں فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات۔ ایک نہایت مستعمل بحر ہے۔ الفاظ نہایت آسانی سے اس کا جامہ قبول کر لیتے ہیں۔ شعراء اردو اکثر اس کو کام میں لاتے ہیں لیکن عیب اس میں یہ ہے کہ مصرعوں میں رقص صوتی کم پیدا ہوتا ہے مثلاً یہ فارسی شعر

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو   گیر و دار و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

جو وصل و ترکیب کی بیش بہا مثال ہے۔ باوجود استاد کی کاوش و کاہش کے معیار رسا نہیں ہوا اس کے مقابلہ میں یہ ترانہ ریز شعر ملاحظہ ہو۔

ہمنشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزم عیش دوست   واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

غالب کے شعر کی موسیقی خوبی بلا امدادِ ساز و ترنم کے ترتیل سے دریافت ہو سکتی ہے۔

(۳)

تنازع البقا میں مغلوب ہو کر ایشیائی ایسے مرعوب ہو گئے ہیں کہ اپنے ہر فعل و خیال کا موازنہ مغربی اقوال اور آراء سے کرنے لگے ہیں۔ یہ وہ غلامی ہے جس کی

سمائی ہیں وہیں وہ بحریں بھی موجود ہیں جن کی صورت ازروئے اقلیدس خطوطِ منحنی اور دوائرے مشابہ ہے۔ جہاں رواں بحریں موجود ہیں وہیں اُفتاں وخیزاں بحریں بھی ہیں مثلاً

کہتے ہیں نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

کارگاہِ ہستی ہیں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

آئے مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے کو سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

بہت سے شعراء جن میں استاد شامل ہیں عروض کو شعر کی تکمیل کے لئے کافی خیال کرتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ عروض کا مدعا اس موسیقی کی طرف سامعہ کو رہنما کرتا ہے جو قالبِ شعر کو اپنے دخل سے زندہ کرتی ہے۔ اگر شعر ازروئے مفاعلین مفاعلن مفاعیلن درست ہو لیکن آہنگ تشنہ رہ جائے تو سامع

پوشیدہ حُسن آفرینی میں مصروف ہیں۔ شاعر یہ کام علی الاعلان کرتا ہے۔

اس لحاظ سے مرزا کو ایک رب النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ غالب نے بزم ہستی میں جو فانوس خیال روشن کیا ہے۔ کونسا پیکرِ تصویر ہے جو اس کے "کاغذی پیرہن" پر منازلِ زیست قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔

(۳)

اگر ادبی حیثیت سے غور کیا جائے تو **دیوان غالب** یکتا ہے۔ بلاغت یعنی تقلیل الفاظ بلا اختلال معنی اس سے زیادہ محال ہے کہیں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جسکو پرکن کہا جا سکے۔ فصاحت کی یہ کیفیت ہے گویا دریائے لطافت رواں ہے۔

اگر بوطیقا کی رو سے لحاظ کیا جائے تو یہ کتاب اپنا آپ جواب ہے۔ شعر کی بنیاد عروض پر قایم ہے۔ عروض موزونیت کی میزان میں الفاظ کے تولنے کا نام ہے۔ نقطہ التعدیل کو پانے کے لئے صدہا نازک سے نازک اور گراں سے گراں اوزان سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ اوزان شاعری نے موسیقی سے مستعار لئے ہیں کوئی آسان سے آسان اور مشکل سے مشکل بحر ایسی نہیں جس میں مرزا نے کلام موزوں نہ کیا ہو جہاں اُن کے یہاں وہ بحریں ہیں جو خطِ مستقیم سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؁

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے دیوانِ مرا شہرت پرویں بودے
غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس **وید اور دیوان غالب**۔ لوح سے تت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں۔ کونسا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔ شاعری کو اکثر شعرا نے اپنی اپنی حدِ نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز جذبہ، اور وجدان، ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے۔ مگر یہ تقسیم خود اُن کی نارسی کی دلیل ہے۔ شاعری انکشافِ حیات ہے۔ جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔

جمالِ الٰہی ہر شے میں رونما ہوتا ہے، آفرینش کی قدرت، جو صفات باری میں سے ہے شاعر کو بھی ارزانی کی گئی ہے۔ جہاں ملائکہ کارخانۂ ایزدی میں

مگو گذشتہ رفیقانِ دل فراموش شدند ‏ ‏ ‏ کدام نالہ کہ در پردہ اش نے جوش شدند

چراغِ انجمنِ حیرتِ نظر بودند ‏ ‏ ‏ کنوں بہ پردۂ دل داغہائے خاموش شدند

نہ رفتہ اند ازیں بزم تا سخن باقیست ‏ ‏ ‏ ز دیدہ رفتہ حریفاں ہنوز در گوش شدند

دعا ہے کہ خدا اس کو بھی غالب کے کلام کے ساتھ قبول عام اور بقائے دوام کا خلعت عطا فرمائے اور مرحوم کی روح پر فتوح پر اپنے اشفاق بیکراں اور الطاف بے پایاں کے پھول برسائے۔ وَیَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ آمِیْنًا ؎

خاکسار

مفتی محمد انوار الحق عفا اللہ عنہ

اشاعت سے اور ہمکو انکی افادت سے محروم کردیا اور بقول غالب ؎

خوں گشت و در دل و جگر توستان فتاد — آں بادہائے ناب کہ زو ناکشیدہ ماند

وہ حقائق آگاہ دماغ جو فلسفیانہ گتھیاں سلجھایا کرتا تھا اب قیامت کی نیند سو رہا ہے اور وہ گوہر فشاں قلم جو دریائے معانی بہایا کرتا تھا ہمیشہ کے لئے ساکن اور ساکت ہو گیا ہے اور جو کچھ اُنھوں نے لکھدیا ہے اب اُس میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی کا امکان نہیں۔ تعویذ قبر انکی تصنیفات کا حرز بازو بن گیا ہے اور رحمتِ حق نے انکو اپنی آغوش محبت میں لیکر مخالفوں کی نکتہ چینی سے بالا اور موافقوں کی مدح سرائی سے بے نیاز کردیا

لیکن بہر حال اب انکے مسودے کا ایک ایک نقطہ اور ایک ایک لفظ انکے احباب کی نظروں میں گہر یکتا اور دُرِ بے بہا ہے۔ آہ وہ ایک بچھڑے ہوئے دوست کی تحریر ہے جس کی صدائے روح پرور اب کبھی کانوں میں نہیں آئیگی۔ جس کی آواز دل آویز کبھی سامعہ نواز نہ ہوگی۔ اِس لئے یہ تبصرہ بلا کم و کاست اِس دیوان کے مقدمہ کے طور پر ایکے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ تاکہ علم دوست اصحاب اُسکے مطالعہ سے لطف اندوز ہوں اور مرحوم کے تبحر علمی کی داد دیں۔ اور مرحوم کے کثیر التعداد احباب اسے پڑھیں اور اس کے الفاظ میں اس یارِ رفتہ کے لطفِ صحبت کی یاد سے لذت یاب ہوں۔

بیدل علیہ الرحمہ نے سچ کہا ہے۔

جو تسلیم ہی کر لیا جائے نہیں بعض جگہ خود مجھ کو بھی اس سے ایک گونہ اختلاف ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم کا تخیل خود اتنا بلند پرواز اور آسمان پیما واقع ہوا تھا کہ غالب کے اشعار میں جن باریکیوں تک ان کی نظر پہنچتی تھی وہاں تک عام طور پر کسی کی رسائی ہی نہیں تھی یہی وجہ تھی کہ وہ غالب کے اتنے مداح اور معتقد تھے کہ وہ اس کی گوناگوں معنوی خوبیوں کے سامنے اس کے چند لفظی اسقام کی کچھ وقعت نہ کرتے تھے بلاشبہ انہوں نے انکی بابت جو کچھ لکھا ہے وہ جوش عقیدت اور فرط محبت کی ایک مسلسل داستان ہے اور سچ یہ ہے کہ بڑی کوشش و کاوش کے ساتھ لکھی گئی ہے جن اصحاب کو اس سے اختلاف ہو ان کی نسبت غالب نے خود ہی کہا ہے اور خوب کہا ہے۔

فرق است نہ اندکے دلم تا بدل تو　　معذوری اگر حرف مرا زود نیابی

ممکن ہے کہ مرحوم اس تبصرہ پر نظر ثانی کرتے کیونکہ ابھی تک انہوں نے اس مضمون کو ختم نہیں کیا تھا اور قرین قیاس ہے کہ اس میں اور کچھ رد و بدل ہوتا۔ کیونکہ جو کچھ لکھا گیا تھا وہ مروجہ اور مطبوعہ دیوان کے متعلق تھا اور اب ایک سو برس کے قلمی دیوان میں غالب کا غیر مطبوعہ اور قلمزدہ کلام مل جانے سے میدان سخن فراخ ہو گیا تھا۔ مقابلہ کے لئے نئے نئے مضمون ہاتھ آ گئے تھے اور مرحوم کی نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی کے لئے نہایت وسیع جولانگاہ مہیا ہو گیا تھا۔ لیکن افسوس کہ ان کی مرگ بے ہنگام نے بہت عجلت کی اور دستبرد اجل نے ان کو اتنی

شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیا تھا۔ اس سے انکی باریک بیں اور نکتہ رس نگاہ میں وہ وسعت پیدا ہو گئی تھی جو فی زمانا ابنائے ملک میں بہت شاذ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب انجمن ترقیِ اُردو نے دیوان غالب اُردو کی ایک نئی اشاعت کا ارادہ کیا تو نظرِ انتخاب مرحوم ہی پر پڑی اور انھوں نے بھی اس ملکی اور ادبی خدمت کو بطیبِ خاطر قبول کیا۔ اور اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ اس کام کے لئے اُن سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہ تھا۔

مرحوم نے بڑے اہتمام سے اس کے سر انجام کا قصد کیا۔ سب سے پہلے دیوان غالب کے مختلف اور متداول نسخے بہم پہنچا کر نہایت احتیاط سے انکی تصحیح کی اور اسکے ساتھ ہی غالب کی شاعری پر ایک ضخیم اور بسیط تبصرہ لکھنا شروع کیا۔ جس میں انھوں نے من حیث الشاعر غالب کا مقابلہ اکابر شعرائے یورپ سے کیا اور دکھا دیا کہ فقط اُردو زبان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کی بزم ادب میں اس دہلی کے خاک نشین کی شاعری کا کیا رتبہ ہے۔ اُنہوں نے اس کے کلام پر مختلف پہلوؤں سے نہایت عمیق نظر ڈالی اور اُنکے فلسفیانہ دماغ اور شاعرانہ طبیعت نے اس میں ایسے عجیب غریب حقائق کا اظہار کیا جن سے غالب ایک فصیح البیان شاعر کی بجائے قدرت کا ایک رمز شناس فلسفی اور حقیقت آگاہ حکیم معلوم ہونے لگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بلا چون و

مجھ سے لے لی گئی۔ اور اسی سبب سے اس دیوان کو تصاویر سے مزین کرنے کا خیال چھوڑنا پڑا۔ بے اعتنائی کی انتہا تو یہ ہے کہ مرحوم کے والد ماجد نے بھی میری استدعا کو عدیم الفرصتی کے عذر سے ٹال دیا۔ اس کے بعد میں اس مقصد میں کامیابی سے بالکل مایوس ہو گیا۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

یہ بھی ممکن ہے کہ مرحوم کے احباب نے اپنے عزیز دوست کے حالات زندگی میرے سپرد کرنے میں دریغ کیا ہو۔ یا انھوں نے مجھے اس اہم خدمت کے قابل نہ سمجھا ہو۔ اس لحاظ سے وہ یقیناً اس خموشی میں حق بجانب ہیں۔ لیکن میرا عذر اس بارے میں یہی ہے کہ میں مامور تھا۔

مرحوم کی علمی قابلیت کی نسبت تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن شاید ابنائے وطن کو یہ بات بالعموم معلوم نہ ہو کہ مرحوم کو اوائل عمری سے شعر و سخن کا بھی شوق تھا اور اگرچہ انکی طبعی خاموشی اور فطری ذوقِ کتب بینی نے ان کو خود شعر گوئی کی بہت کم مہلت دی۔ تاہم نقادِ سخن کی حیثیت سے وہ اپنی آپ ہی نظیر تھے زباندانی سے اُن کو خاص مناسبت تھی اور انھوں نے اثنائے قیام یورپ میں اکثر السنۂ مشرقی و مغربی میں قابلیت بہم پہنچا کر ان کے مشہور و مقبول

خیال تھا کہ اس موقع پر مرحوم کے کچھ مختصر حالات زندگی بھی ہدیہ ناظرین کئے جائیں لیکن افسوس ہے کہ تعلقات ظاہری کی ناپائداری اور محبت ابنائے زماں کی بے ثباتی نے مرحوم کے انتقال کے بعد اُن کے احباب کو اُن کی طرف سے اتنا تغافل شعار اور فراموش کار بنا دیا کہ سخت سعی و کوشش اور پیہم تقاضے اور یاد دہانیاں بھی اُنکو مرحوم کے حالات قلمبند کرنیکی طرف مائل نہ کر سکیں۔

خود مجھ کو اُن کے انتقال سے صرف دو سال پہلے اُن کے بھوپال آنے پر اُن کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ اس لئے میں اُن کے سوانح سابقہ سے بالکل بے خبر تھا لیکن اپنی اس کمی کی تلافی کے لئے میں نے حتی الامکان اُن کے اکثر بڑے بڑے دوستوں سے مراسلت کی۔ وعدے بھی ہوئے۔ امیدیں بھی دلائی گئیں چنانچہ انھیں توقعات پر مرحوم کے مقدمۂ دیوان غالب نے عرصہ تک اِدھر اُدھر کی سیر کی اور مہینوں نہیں بلکہ برسوں تک اُن کے بعض دلی دوستوں کی میز نسیاں کا زینت افروز رہا اور زیادہ تر اسی وجہ سے اس دیوان کی اشاعت میں اس قدر تاخیر ہوئی لیکن افسوس کہ اِن سب کوششوں کا انجام حسرت اور ناکامی کے سوا اور کچھ نہ ہوا اور حالات زندگی کا بہم پہنچانا کجا مرحوم کی ایک تصویر جس کو اس کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ تھا وہ بھی

عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم

داغ بودم کہ چہ خواہم بہ غمت انشا کرد
نقطۂ اشک رواں گشت و خطے پیدا کرد
(بیدل)

آہ۔ کیا انقلاب لیل و نہار کیسی گردشِ روزگار ہے کہ یہ کتاب جسے فخرِ قوم جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مرحوم ایسے شوق سے چھپوانے کی تیاری کر رہے تھے آج انکی یادگار کے طور پر شائع ہو رہی ہے اور یہ ورق جو اُن کے رشحاتِ قلم سے رونقِ گلزار ہونے والا تھا اس وقت معناً ان کا کتابۂ مزار ہے۔

یوں تو دنیا میں آمد و رفت کا سلسلہ ہمیشہ جاری ہی رہتا ہے اور بلاشبہ پیدا ہونا ہی مرنے کا پیش خیمہ ہے۔ مگر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری جیسے فاضل کی موت ہزاروں لاکھوں کی موت پر بھاری ہے۔ ایسے اربابِ کمال اس دارِ ناپائدار میں روز روز نہیں آتے۔

عمرہا باید کہ تا یک مرد صاحبدل شود
بایزید اندر خراساں یا اُویس اندر قرن
(ابن یمین)

لیکن کیا کیا جائے فرمانِ الٰہی میں مجالِ دم زدن نہیں۔

ناقابلیت کیوجہ سے ہے کہ غالب جیسے شخص کا دیوان مجھ ایسے قلیل البضاعت اور ہیچمدان کے ہاتھوں سے مرتب ہو۔ لیکن مرحوم نے پہلے ہی کہدیا ہے کہ

چشمِ کور آئینۂ دعویٰ بکف خواہد گرفت　　دستِ شل مشاطۂ زلفِ سخن خواہد شدن

یہ انکی ایک اور پیشین گوئی ہے جو اس طرح پوری ہوئی۔ بہر حال لوگوں کو دیوان سے مطلب ہے مدوّن سے کیا کام۔ ہاں سب سے زیادہ شکر گزاری کے قابل عالیجناب جلیل القدر افتخار الملک نواب زادہ حاجی کرنل **محمد حمید اللہ خان** صاحب بہادر بی۔ اے۔ سی۔ ایس آئی چیف سکرٹری ریاست بھوپال ہیں جنکی بے قدر دانی نے اس دیوان کو زیور طبع سے مزین کیا اور ملک و قوم کو اس سے بہرہ اندوز ہونیکا موقع دیا۔ میں کہ اُن کی بارگاہ فیض کا ایک ادنے نمک پروردہ ہوں میرا کیا منہ ہے کہ اُنکی تعریف و توصیف میں لب کشا ہو سکوں یا انکی جہان مندی کا حق ادا کر سکوں۔ کاش غالب ہوتا کہ اُسے زمانہ کی ناسازگاری کا گلہ اور ممدوحین کی ناشکر گذاری کا شکوہ نہ رہتا اور وہ انوری کا ہمزبان ہو کر یہ نہ کہتا کہ :-

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح　　اے دریغا نیست محبوبے سزاوارِ غزل

میں تو زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ غالب کو اپنا ہمنوا بنا کر اپنی اور انکی اور تمام دنیا کیطرف سے یہ کہوں کہ

برائے شاہ ز یزداں طلب کنم شش چیز　　بصد ہزار تضرع ز روئے عجز و نیاز

تنِ درست و دلِ شاد و طالعِ فرخ　　شکوہِ وافر و ملکِ وسیع و عمرِ دراز

(آمین)　　خاکسار۔ مفتی محمد انوار الحق عفی عنہ

بھی حق نہیں ہے کہ ہم ان کے ان جگر پاروں کو جسے انہوں نے بادلِ ناخواستہ حذف کر دیا تھا اور کچھ نہیں تو اُن کی یادگار ہی کے طور پر محفوظ رکھیں۔ فارسی کو جانے دیجئے انہوں نے اُردو نظم و نثر کی جو بے بہا خدمت کی ہے اُس کے لحاظ سے وہ اِس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی اس ابتدائی مشقِ سخن کو باقی رکھا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آجکل کی زندہ اور زندہ دل قومیں اپنے اسلاف کی ادنیٰ ترین چیزوں کو بھی کیسے ادب و احترام سے جمع کرتی ہیں اور انکی غلطیوں اور لغزشوں کو بھی کیسا کارآمد اور سبق آموز بنا لیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ انکے ہاں ایک ایک مسودہ ہزاروں اشرفیوں میں بک جاتا ہے اور ایک ایک ردی اور مستعمل ٹکٹ (جس کا ہمارے ذہن میں کوئی مصرف آتا ہی نہیں) جواہرات کا ہم قیمت ہو جاتا ہے حالانکہ یہ تعلیم ہمارے ہی ایک بزرگ کی دی ہوئی ہے جس نے فرمایا ہے

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن　　　تا بماند نامِ نیکت یادگار

مجھے خیال ہے کہ شاید ایک بار غالب کے مزار پر ایک مقبرہ بنانے کی تحریک ہوئی تھی مگر ملک کی عام فرومائیگی اور پست ہمتی سے جہاں اور صدہا تجویزیں ہو ہو کر رہ گئیں وہاں اسکا بھی کچھ عملی نتیجہ نہ نکلا۔ خیر۔ مقبرہ تو خواہ بنے یا نہ بنے لیکن اس دیوان کا شائع ہونا تو ہر حیثیت سے اتنا ضروری اور لازمی ہے کہ میں اس عنوان پر اس سے زیادہ زور دینا فضول سمجھتا ہوں اور قدردانانِ غالب سے اس سے زیادہ بدگمان ہونا گناہ خیال کرتا ہوں ہاں شرمساری مجھے خود بھی

دوسری تھی۔ مگر اس کے دستیاب ہو جانے کے بعد اس کی بجنسہٖ اشاعت ایک ادبی خدمت اور ایک قومی فرض ہے جس سے ہم اس کی ادائے بغیر کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اس کے ساتھ ہم کو یہ بھی خیال کرنا چاہئے کہ غالب نے کیسی حسرت و مجبوری سے اپنے ان لخت ہائے دل کو کاٹنا گوارا کیا ہوگا۔

مولانا حالی مرحوم خود شاعر تھے اور شعر گوئی کی وقعت اور محنت کو جانتے تھے اس لئے ان کا قول اس بارہ میں مستند ہے وہ فرماتے ہیں: "ان اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جانکاہی اور جگر کاوی سے سرانجام کئے ہونگے جبکہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دُکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دُکھا ہوگا۔" (یادگار غالب صفحہ ۱۰۰)

غالب نے خود بھی اپنے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب میں شاعری دماغ سوزی کو بڑے لطیف اسلوب سے بیان کیا ہے کہتے ہیں:۔

سخن در اصل ہمانا بود سیہ خونے ۔۔۔۔ کہ کاوشِ زرگِ کلکِ مشکبار کشد
کشد چہ رنج سخنور کہ نقشہائے بدیع ۔۔۔۔ زبہر آنکہ گذارد بہ یادگار کشد

تو کیا اب ان کا ہم پر (جو ان کے سخن فہم اور قدردان ہونے کے مدعی ہیں) اتنا

حقیقت میں اگر غور سے دیکھا جائے تو غالب کے یہی نظری اشعار آئندہ کے لئے سینکڑوں نئے نئے خیالات کا چشمہ بن سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اپنی موجودہ صورت میں وہ بہترین اشعار میں شمار ہونے کے قابل نہوں تاہم اُن میں ایسی نئی طرحیں اور تازہ روشیں ڈالی گئی ہیں کہ اُن کی داغ بیل پر صدہا طرح کی گلکاریاں اور بزم آرائیاں کیجا سکتی ہیں اور خواہ ان کو کوئی سخن فہم مہمل اور بے معنی ہی کہے پھر بھی ان میں ایسے گنجینہ ہائے معانی پنہاں ہیں کہ اُن سے ہزاروں نئے نئے مضمون پیدا ہو سکتے ہیں سینکڑوں نئی نئی ترکیبیں اور نئی نئی تشبیہیں ان میں جواہر ریزوں کیطرح بکھری ہوئی ہیں اور یقیناً اس زمانہ میں جبکہ اُردو زبان کی ترقی اور توسیع کا غور ہو رہا ہے ان کو رائیگاں چھوڑ دینا میرے نزدیک ایک ناقابل تلافی قصور ہے۔

اس دیوان کی اشاعت کے جو وجوہ یہاں تک عرض کئے گئے وہ فقط اصولِ افادہ کے مطابق یعنی محض خودغرضی پر مبنی ہیں۔ کیونکہ اِن میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس سے ہمکو ذاتی طور پر کیا فائدہ ہونا ممکن ہے۔ لیکن میرے نزدیک ان کے سوا ایک وجہ اور بھی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ غالب کو خود اپنے کلام کے حذف و اخراج کا اختیار تھا۔ اس نے جس حصہ کو چاہا رہنے دیا اور جس کو چاہا نکال دیا لیکن ہم اس کے مجاز نہیں ہیں جب تک یہ قلمی نسخہ نہیں ملا تھا تب تک صورتِ حال

ت سر مو تجاوز نہ کریں اور اُن کے نقشِ قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں وہ اپنے ارادہ اور اختیار سے ایسا نہیں کرتے بلکہ دوسرے راستہ پر چلنا اُنکی قدرت سے باہر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے جنکی طبیعت میں اُپجناپن اور غیر معمولی اُپج کا مادہ ہوتا ہے وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی پر اُن کو مجبور نہیں ہونے دیتی اِن کو قوم کی شاہراہ کے سوا بہت سی راہیں ہر طرف کھُلی نظر آتی ہیں وہ جس عام روش پر اپنے ہمجنسوں کو جاتا دیکھتے ہیں اُس پر چلنے سے اُن کی طبیعت اِبا کرتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جو طریق غیر مسلوک وہ اختیار کریں وہ منزلِ مقصود تک پہنچانے والا نہ ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ جبتک وہ دائیں بائیں چل پھر کر طبیعت کی جولانیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چور نہو جائیں عام راہ گیروں کی طرح آنکھیں بند کر کے شارعِ عام پر ٹھہر جائیں۔ مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی۔ وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک بھوں چڑھاتے تھے وہ خستِ تنگی شعر کا کے سبب خود شاعری سے نفرت ظاہر کرتے تھے اور عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہوسکتا تھا اجتناب کرتے تھے۔ (یادگارِ غالب صفحہ ۱۰۳)

یہی جدت طرازی اور ندرت پسندی تھی جس نے اُس وقت غالب کو اپنے اشعار کے حذف واسقاط پر مجبور کیا تھا اور یہی ہے جس نے اب اُسکے منتخب کلام کو اُردو زبان کا مایۂ ناز بنا دیا ہے۔

ہم نے ان تمام مختلف اصلاحوں کو حاشیے پر درج کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں ان سے غالب کی شاعری کی تاریخ پر قابلِ قدر روشنی پڑتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ یہ نظری اشعار بھی اپنا ایک خاص انداز رکھتے ہیں اور ان میں بھی حسنِ تخیل اور جدتِ مضمون کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ لیکن ان کا انتخاب میں ناظرین کی سخن فہمی پر چھوڑتا ہوں۔ ان پر سب سے بڑا اعتراض جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں فارسیت کا رنگ غالب ہے۔ مگر یہ ایک ایسا اعتراض ہے جو غالب کے اور اشعار پر بھی وارد ہوتا ہے۔ لیکن آخر فارسی کا مذاق کفر و الحاد نہیں کہ آدمی مردود ازلی ہو جائے غدر و بغاوت نہیں کہ اس کی سزا قتل قرار پائے۔ ہے تو فقط اتنا ہے کہ زمانہ کی بے اعتنائی نے اسے طبیعتوں پر گراں اور دلوں پر بار بنا دیا ہے۔ اس لئے اب جو چاہے کہئے۔ لیکن پھر بھی بقول مولانا حالی مرحوم "مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو۔ یا اس کو اردو زبان کے دائرہ سے خارج سمجھو۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس میں ان کی اُپج جبلّی اور غیر معمولی اُپج کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہی ان کی ٹیڑھی ترچھی چالیں ان کی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت اور استعداد پر شہادت دیتی ہیں۔ معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پگڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلہ چلا جاتا ہے اس پر آنکھیں بند کر کے گلے کے پیچھے پیچھے ہو لیں۔ اور کھیت کے ادھر ادھر آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں۔ جو ہنر یا پیشہ اختیار کریں اس میں اگلوں کی چال ڈھال

بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ کلام جو مسودہ زیرِ اعتراض ہے غالب کے اوائل عمر کا کہا ہوا ہے اور اگر اس میں کچھ خامیاں ہوں بھی تو اُن سے اُنکے کمال میں نقص نہیں آتا۔

لیکن کہا جا سکتا ہے کہ پھر ان ابتدائی مشقوں کو شائع کرنے سے کیا فائدہ؟

سب سے بہتر جواب وہ نوعِ انسان کے مایۂ ناز فلسفی دے سکتے ہیں جنہوں نے اپنی عمریں مختلف اشیاء کے مدارج ارتقا کے مطالعہ میں صرف کر دی ہیں اور جو اس تحقیق و تدقیق کو کشفِ حقائق کا ذریعہ اور آئندہ ترقی کا راز سمجھتے ہیں۔ دنیا کی تاریخی ادبیات میں ایسی مثالیں بہت شاذ ہیں کہ ہم کو کسی اُستادِ باکمال کے ابتدائی مراتب اور ارتقائی مدارج کا صحیح حال معلوم ہو سکے۔ یہ محض حسنِ اتفاق ہے کہ اس قلمی نسخے کے مل جانے سے ہم کو غالب جیسے مسلم الثبوت اور قادر الکلام استاد کی شاعری کے درجہ بدرجہ نمونے نظر آتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں اسکے اشعار کا کیا انداز تھا اور پھر اس میں رفتہ رفتہ کیا کیا تغیر ہوا۔ چونکہ ہم اس نسخے کی صحیح تاریخ کتابت بھی جانتے ہیں اس لئے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ پچیس ۲۵ برس کی عمر میں بھی اس کی شاعری کسقدر ترقی کر چکی تھی اور ابتدائی وقت اور زمانے کے مقابلے میں کتنی روانی اور سلاست پیدا ہو گئی تھی۔ نیز چونکہ نظرِ ثانی کے وقت اس میں غالباً غالب نے خود ترمیمیں کی ہیں اسلئے ان کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسکی طبعِ سلیم نے بلا امدادِ استاد خود اپنی اصلاح کیونکر کی ہے۔ اس مصلحت کو پیشِ نظر رکھکر

میں شائع ہوگا تو اور بھی بہت سے حضرات ان کے ہمخیال ہونگے۔ لیکن وہ اس میں معذور ہیں کیونکہ یہ اپنی اپنی رائے اور اپنی اپنی سمجھ ہے ہم کو ان سے کوئی شکایت نہیں غالب نے سو برس پہلے کہا ہے ؎

غالبؔ بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

اس ابتدائی نظری کلام میں جو عیوب و اسقام ہیں ان کی طرف تو ہم خود بھی اشارہ کر چکے ہیں اور یقیناً غالب کا بڑے سے بڑا طرفدار بھی انصاف کا خون کئے بغیر ان سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اس احتمال سے ہم کو اتفاق نہیں ہے کہ ان کی وجہ سے غالب کی موجودہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں کمی ہو جائیگی اور ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہو۔ غالب کا وہ کلام جس کی گوناگوں خوبیوں نے سخن شناس دلوں پر اُس کی یکتائی کا سکہ بٹھا دیا ہے وہ بدستور موجود ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا۔ پھر اگر اس کا کچھ اور نیا کلام مل جائے اور بالفرض وہ مروجہ کلام کی نسبت پست بھی ہو تو کیا اس سے وہ پہلے اشعار بھی پست ہو جائینگے۔ کیا کسی کے بچپن کی کج مج زبانی سے اُس کی آئندہ کی فصاحت و بلاغت پر حرف آسکتا ہے کیا کسی مصور کی ابتدائی مساعی اس کے عہد کمال کی صناعی کی قدر و قیمت کم کر سکتی ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بعینہٖ اسی طرح پہلی

کلام سہل ممتنع ہو جاتا تھا۔

بہر حال ان سب باتوں نے مل جل کر اس زمانہ کے کلام کے ایک معتد بہ حصے میں غرابت اور دشواری پیدا کر دی ہے۔ اور یہ سقم بالخصوص ان اشعار میں نسبتہً زیادہ پایا جاتا ہے جو بوقتِ انتخاب حذف کر دیئے گئے تھے اس لئے یقیناً غالب کے ان احباب پر کسی طرح اعتراض نہیں ہو سکتا جنھوں نے اُن اشعار کے قلمزد کرنے کی رائے دی تھی اور جن کی سخن فہمی اور دقیقہ سنجی نے اس کی بے راہ رو طبیعت کو راہِ راست پر لانے میں سیلِ استاد کا کام دیا۔ عرفی نے خوب کہا ہے۔ ؎

مراد و خضر عنانگیر باید از چپ و راست

کہ کجروی کنم ورنہ گم راہ خطاست

اس بنا پر ہمارے بعض احباب اب بھی اس دیوان کی اشاعت کے خلاف تھے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ جس کلام کو شاعر کے ہمعصر دوستوں نے قابلِ حذف قرار دیا اور جسے خود شاعر نے اپنے دیوان میں سے خارج کر دیا اس کے اب شائع کرنے سے اسکے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا کہ شاعر اپنے پہلے درجہ سے بھی گر جائے اور بلحاظ مجموعی اس کے کلام کی وقعت کم ہو جائے۔ اور ایک صاحب تو اس کے اتنے مخالف ہیں کہ انھوں نے اس کا نام "جہلاتِ غالب" رکھا ہے۔ ممکن نہیں بلکہ یقینی بات ہے۔ کہ جب یہ دیوان ٹنک

اشعار کو عام طور پر کوئی نہیں سمجھتا کیونکہ یہ مشہور رباعی بھی اس میں موجود ہے اس لئے یقیناً پچیس برس کی عمر سے پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

لیکن طبیعت کی افتاد اور فارسی سے قدرتی مناسبت ایسی تھی کہ وہ کسی طرح پیشِ پا افتادہ مضامین اور آسان اور عام پسند الفاظ کا استعمال گوارا نہ کر سکتی تھی کیونکہ انکے نزدیک شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں۔ یہاں تک کہ جب اعتراضات کی بھرمار سے بہت مجبور ہو گئے تو آخر (بقولِ آزاد مرحوم) "اس ملکِ بے نیازی کے بادشاہ نے کہ اقلیمِ سخن کا بھی بادشاہ تھا اپنی غزل کے ایک شعر میں سب کا جواب دیدیا اور سبکو ہمیشہ کے لئے لاجواب کر دیا۔"

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یہ غزل اور یہ شعر بھی اس قلمی نسخے میں موجود ہے اور اسی عہدِ شباب کی یادگار ہے۔ اور اس سے اور اس زمانہ کے اور صدہا شعروں سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجود دقت پسندی جب صاف گوئی اور واقعہ نگاری پر آجاتے تھے تو اس نو مشقی میں بھی اُن کا

بعد ایک زمانہ وہ آیا کہ اُس کی فارسی بھی پایۂ اعتبار سے گر گئی چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "ناصر علی بیدل اور غنیمت۔ ان کی فارسی کیا ہر ایک کا کلام بنظرِ انصاف دیکھیے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟" یہ تغیر مشق کی پختگی زبان کی قدرت اور نظر کی وسعت کا پیدا کردہ ہے اس عہد کی اکثر و بیشتر غزلوں میں تخلص اسد ہے۔ یہی وہ دیوان ہے جسکی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں "قبل۔ ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع تھا۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا

اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا آخر جب تمیز آئی تو اُس دیوان کو دور کیا اوراق یکقلم چاک کئے دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان حال میں رہنے دیے۔" ظاہر ہے کہ جب بیدل کی فارسی تک قابلِ سند نہ رہی تو جو غزلیں اُن کے تتبع میں لکھی گئی تھیں اُن کی نسبت اس کے سوا کیا فتویٰ دیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس خط سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ غالب کو اس زمانہ میں اپنے کلام کے اشکال کی خبر نہ تھی بعد میں تمیز آئی نہیں! اس دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس وقت بھی خوب اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے کہ اُن کے

اس میں بھی ویسی ہی نمایاں ہے جیسی بعد کے کلام میں۔ فرق فقط اتنا ہے کہ نشۂ شباب کی ترنگ اور نازک کلامانِ ایران کے رنگ نے ان شعروں کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ابتدائے مشقِ سخن میں بیدل کا طرزِ غالب کا نصب العین تھا اور مضمون آفرینی اور خیال بندی پر تمام ہمت مصروف تھی۔ چنانچہ ناظرین کو غزلوں میں جابجا اس کے جوے ملیں گے۔ میں سند کے طور پر یہاں اُن کے صرف چند شعر پیش کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:۔

اسد ہر جا سخن نے طرح باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہارِ ایجادیِ بیدل پسند آیا

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالبؔ
ساز پر رشتہ پے نغمۂ بیدل باندھا

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

آہنگِ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

دل کارگاہِ فکر و اسد بے نوائے دل
یاں سنگِ آستانۂ بیدل ہے آئینہ

اسد قربانِ لطفِ جورِ بیدل
خبر لیتے ہیں لیکن بیدلی سے

ہے خامہ فیضِ بیعتِ بیدل بکف اسد
یک نیستاں قلمروِ اعجاز ہے مجھے

گر ملے حضرت بیدل کا خطِ لوحِ مزار
اسد آئینۂ پردازِ معانی مانگے

جوشِ فریاد سے لوں گا دیتِ خواب اسد
شوخیِ نغمۂ بیدل نے جگایا ہے مجھے

ان شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں غالب پر بیدل کا کتنا گہرا اثر تھا یا یکے

تفصیل لطافت اور بلاغت سے مولانا حالی مرحوم یادگار غالب میں اس فرض کو ادا
کرچکے ہیں اس سے زیادہ اور کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں ڈاکٹر عبدالرحمن
صاحب بجنوری مرحوم کا مبسوط مقدمہ شائع ہو رہا ہے جس میں غالب کی شاعری کے مختلف
پہلوؤں پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر شخص کا مذاقِ سخن
مختلف ہوتا ہے۔ اور وہ ہر ایک شاعر کے کلام پر اپنے خاص نقطۂ خیال سے نکتہ چینی کرتا
ہے اور اسی پر اس کے رد و قبول کا فیصلہ مبنی ہوتا ہے اور دوسروں کی تائید یا تردید
اس فیصلہ پر کچھ بہت زیادہ اثر نہیں ڈال سکتی اسلئے خواہ مخواہ اپنی رائے پیش کرنا میرے
نزدیک فضول ہے۔ دیوان حاضر ہے اور ہر شخص خود اس کے حسن و قبح کا اندازہ کرسکتا ہے
لیکن بہر حال چونکہ اس قلمی دیوان کے اشعار پر اب تک کوئی رائے زنی نہیں ہوئی اسلئے
میں بہ پابندیٔ رسم صرف اس پر ایک سرسری اور اجمالی تبصرہ کرتا ہوں یہ تو ظاہر ہے
کہ یہ کلام غالب کے بالکل ابتدائی زمانے کا ہے اس کی تاریخ کتابت بتا رہی ہے کہ
جب یہ نسخہ لکھا گیا تھا اُس وقت ان کی عمر صرف پچیس سال کی تھی اس لئے کلام میں وہ
روانی اور پختگی کی توقع نہیں کیجا سکتی جو بعد کی غزلوں کا مابہ الامتیاز ہے اور کہیں کہیں
بندش کی چستی اور مضمون کی پستی مذاقِ سلیم کی نظروں میں کھٹکتی ہے۔ تاہم بحکم عموم
ترکیبوں کی جدت تشبیہوں کی ندرت خیالات کی بلند پروازی اور مضامین کی آسمان پیمائی

ہوئی ہے وہاں ان مصرعوں کو اوپر نیچے لکھ کر سامنے ایک قوس بنا کر دوسرا مصرع لکھ دیا ہے۔ اور یہ التزام رکھا ہے کہ ہر جگہ جو مصرع اُوپر لکھا ہے وہ قلمی نسخے کا ہے اور جو اس کے نیچے لکھا ہے وہ مروجہ دیوان کا۔ اس میں مصلحت یہ سمجھی ہے کہ تدریجی اصلاح کی کیفیت واضح ہو جائے۔ ہمطرح غزلوں کے بعد اس ردیف کی قلمی نسخے کی وہ غزلیں لکھ دی گئی ہیں جو بالکل نئی ہیں یعنی جن کا کوئی شعر بھی مروجہ دیوان میں موجود نہیں اور پھر ان کے بعد مروجہ دیوان کی وہ غزلیں درج کی ہیں جو ۱۲۳۱ھ کے بعد بڑھائی گئی ہیں اور جن کا کوئی شعر قلمی نسخے میں نہیں ہے۔ یوں ہر ایک ردیف کے کل شعر ایک جگہ جمع کر دیے گئے ہیں جن میں ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ ابتدا میں غالب کے دیوان کی کیا شان تھی اور بعد میں کیا ہو گئی۔ اگر بوقتِ مطالعہ اس گذارش کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا تو یقین ہے کہ کتاب زیادہ مفید اور دلچسپ معلوم ہو۔ اس کی کتابت میں حتیٰ المقدور صحتِ املائی کا بہت لحاظ رکھا گیا ہے اور جابجا علاماتِ اضافت و توقف بھی بنانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ پڑھنے اور مطلب سمجھنے میں آسانی ہو جائے بخدا گر کرد یہ مساعی مشکور ہوں۔

رسم مستمرہ متقاضی ہے کہ یہاں غالب کے کلام کی بھی تنقید کیجائے لیکن میں متعدد وجوہ سے اس کی جسارت کرنے سے قاصر ہوں۔ اوّل تو مجھے بھی عذر ہے کہ جس

چونکہ ارادہ یہ ہے کہ ناظرین کے سامنے غالب کے کلام کا ایک مکمل مجموعہ پیش کیا جائے اور ساتھ ہی قلمی اور مروجہ دیوانوں کے شعر بھی پہلو بہ پہلو دکھائے جائیں تاکہ یہ بات آئینہ ہو جائے کہ اصل دیوان میں سے کون کون سے شعر حذف کر دیئے گئے تھے اور پھر بعد میں غالب نے ان میں کیا کیا رد و بدل کیا۔ اسلئے اس کتاب میں یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ ہر ایک ردیف میں پہلے دونوں دیوانوں کی ہمطرح غزلوں کو لکھا ہے اور ان میں اوّل قلمی نسخے کی غزل بجنسہٖ نقل کر دی ہے اور اس میں جو شعر مروجہ دیوان میں موجود ہیں ان کے سامنے "م" لکھ دیا ہے تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ ابتداءً یہ غزل اس طرح کہی گئی تھی اور اس میں فلاں فلاں اشعار (جن کے سامنے "م" لکھا ہوا ہے) مروجہ دیوان میں موجود اور دونوں دیوانوں میں مشترک ہیں اس کے بعد اس طرح کے جو شعر قلمی دیوان کی کتابت یعنی ۱۲۳۷ھ کے بعد کہے گئے ہیں اور اب مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں ان کو لکھ دیا ہے تاکہ پوری غزل پیش نظر ہو جائے۔ مشترک شعر جو قلمی نسخے کی غزل میں اوپر درج ہو چکے ہیں اور جن کو "م" کے اشارہ سے ممتاز کر دیا ہے ان کو اب دوبارہ مروجہ دیوان کے بقیہ شعروں کے ساتھ لکھنا غیر ضروری تھا ناظرین آسانی سے امتیاز کر سکتے ہیں۔ بعض جگہ ایسا بھی ہے کہ شعر تو دونوں دیوانوں میں موجود ہے لیکن کسی مصرع میں کوئی خفیف سی لفظی ترمیم

ردیف	قلمی دیوان		مطبوعہ دیوان	
	غزلیات	اشعار	غزلیات	اشعار
الف	۶۰	۴۰۵	۴۶	۳۰۴
ب	۲	۱۳	۱	۱۲
ت	۲	۱۱	۳	۱۹
ث	۲	۱۳	۰	۰
ج	۲	۱۴	۲	۴
چ	۳	۲۳	۱	۲
ح	۱	۵	۰	۰
د	۵	۴۰	۱	۹
ر	۸	۵۶	۹	۶۹
ز	۹	۵۹	۵	۲۳
س	۳	۱۶	۱	۷
ش	۲	۱۴	۱	۲
ع	۲	۱۳	۲	۸
غ	۲	۱۲	۰	۰
ف	۲	۱۱	۱	۲
ک	۴	۳۰	۲	۱۵
گ	۰	۰	۱	۲
ل	۵	۳۴	۱	۹
م	۵	۳۶	۳	۸
ن	۲۸	۱۸۹	۳۳	۲۲۵
و	۶	۴۷	۱۱	۸۱
ہ	۸	۵۴	۲	۳
ی	۱۱۴	۷۸۸	۱۰۴	۶۵۰
ے	۰	۰	۰	۰
میزان	۲۷۵	۱۸۸۳	۲۳۰	۱۴۸۸

لیکن ہم نے تبرکاً اسے بھی قصائد سے پہلے درج کر دیا ہے۔ اس کے بعد تین قصیدے اردو کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک تفکرات زمانہ نے غالب کو اہل دول کی مدح سرائی پر مجبور نہیں کیا تھا کیونکہ یہ تینوں قصیدے منقبت میں ہیں۔ پہلا قصیدہ ۱۱۰ شعروں کا ہے دوسرا ۶۷ کا اور تیسرا ۲۹ کا لیکن مروجہ دیوان میں صرف پہلے اور دوسرے قصیدے کے ۲۸ - اور ۲۳ شعر شائع ہوئے ہیں اور تیسرے قصیدے کے فقط دو شعر غزلیات کے ضمن میں درج ہیں۔ غزلوں کی تعداد ۲۷۵ ہے جن میں ۱۸۸۳ شعر ہیں ان میں سے نصف کے قریب اشعار مروجہ دیوان میں موجود ہیں۔ آخر میں گیارہ رباعیاں ہیں قطعات وغیرہ کچھ نہیں۔ ناظرین کی دلچسپی اور آگاہی کیلئے میں یہاں ایک نقشہ پیش کرتا ہوں جس سے ردیف وار قلمی اور مطبوعہ دیوانوں کی غزلوں اور شعروں کی تعداد بالمقابل معلوم ہو جائیگی۔

خطی مشابہت اور کاتب کی تحریر کا محتاج نہیں ہے بلکہ اس کی سب سے بڑی اور یقینی دلیل خود اس کے اشعار ہیں۔ ع

آفتاب آمد دلیل آفتاب

ناظرین جب اس کا مطالعہ کریں گے تو خود کہہ دینگے کہ یہ غالب کا کلام ہے اور غالب کے سوا اور کسی کا ہو ہی نہیں سکتا۔ مروجہ دیوان میں جتنی کچھ غزلیں ہیں وہ سب اس میں مکمل موجود ہیں۔ جو اشعار متفرق طور پر تلاش کر کے بعض دیوانوں میں بڑھائے گئے تھے اور جن کی بابت قیاسی طور پر کہا جاتا تھا کہ غالب کے ہیں وہ بھی سب کے سب اس میں پائے جاتے ہیں غرض دیوان دیکھنے کے بعد اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ یہ غالب کا وہی دیوان ہے جسے زمانہ کھو چکا تھا اسلئے اس بارہ میں مزید گفت و شنید کی ضرورت نہیں ہے۔

عام دیوانوں کی ترتیب کے برخلاف اس دیوان میں قصائد سے ابتدا کی گئی ہے اور اردو قصیدوں سے بھی پہلے ایک قطعہ فارسی کا فاتحۃ الکتاب بنایا ہے یہ فاتحہ کلیات غالب فارسی مطبوعہ منشی نولکشور لکھنؤ کے صفحہ ۴۷-۴۸-۴۹ پر با اختلاف خفیف موجود ہے لیکن چونکہ قلمی دیوان میں مطبوعہ اشعار کی نسبت پندرہ شعر زیادہ ہیں۔ اور مشترک اشعار میں بھی کہیں کہیں کوئی لفظی ترمیم ہے اس لئے گو اردو دیوان میں اس کی ضرورت نہ تھی

حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر ۱۲۳۷ھ من الہجرت النبویہ صورت اتمام
یافت ۔ اس کا خط نہایت پاکیزہ اور نظر فریب ہے ۔ شروع میں خوبصورت طلائی
کام ہو رہا ہے اور تمام صفحات پر سُنہری جدول ہے جگہ جگہ میاں فوجدار محمد خاں صاحب
کی مہریں ثبت ہیں جن میں سے بعض ۱۲۳۸ھ اور بعض ۱۲۶۱ھ کی ہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے
کہ یہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب
کے پاس بھی گیا ہے اور اُن کی نظر سے گذرا ہے اور اُنھوں نے خود اس میں جا بجا اصلاحیں
کی ہیں کیونکہ اگرچہ ان اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ ہے لیکن پھر بھی اس میں اور
غالب کی طرز تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے اور گو محض
اس کی بنا پر ان کو غالب کا قلمی قرار دینا شاید درست نہو لیکن خود ان اصلاحوں کی
نوعیت ایسی ہے کہ ان کو مصنف کے سوا اور کسی کے قلم کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے
کیونکہ ان میں سے اکثر ایسی ہیں کہ لفظ کو کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھدیا ہے یا کسی
مصرع کی کچھ صورت بدل دی ہے ۔ بہت سی غزلیں بھی اسی قلم سے حاشیہ پر بڑھائی گئی ہیں
جن میں سے بیشتر مروجہ دیوان میں بجنسہ موجود ہیں البتہ بعض ایسی بھی ہیں کہ ان میں
بھی دوبارہ پھر کچھ انتخاب ہوا ہے اور مطبوعہ دیوان میں ان کے پورے شعر شائع
نہیں ہوئے ۔ لیکن حقیقت میں اس امر کا ثبوت کہ یہ کتاب غالب کا گمشدہ دیوان ہی ہے

اس کے علاوہ خود غالب کے مکتوبات نظم و نثر سے بھی اس کا قطعی ثبوت ملتا ہے لیکن اب تو کسی ایسے ثبوت کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ اب تک جس دیوان کو معدوم ثابت کیا جاتا تھا محض حسنِ اتفاق سے وہ بجنسہٖ مکمل حالت میں مل گیا۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست

آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

امید ہے کہ شوق کے ہاتھ اسے ہاتھوں ہاتھ لیں اور قدردانی کی نگاہیں اسے دل میں جگہ دیں۔

اس نایاب کتاب کو محفوظ رکھنے کا شرف کتب خانۂ حمیدیہ بھوپال کو حاصل ہے یہ تو یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دیوان یہاں کیونکر پہنچا۔ لیکن تاریخ کتابت اور مہر وغیرہ سے اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ غالباً رئیسِ وقت نواب غوث محمد خاں صاحب کے بیٹے میاں فوجدار محمد خاں صاحب کے لئے لکھا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے شروع میں ایک صفحہ پر یہ لکھا ہوا ہے "دیوان ہذا من تصنیف مرزا نوشاہ دہلوی المتخلص بہ اسد از کتب خانہ سرکار فیض آثار عالیجاہ عالم پناہ میاں فوجدار محمد خاں بہادر دام اقبالہ قلمی خوشخط"۔ اور اس کے سامنے اُن کی مہر ہے۔ اور خاتمہ پر کاتب کے قلم کی یہ تحریر موجود ہے "دیوان من تصنیف مرزا صاحب و قبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلمہم۔ بہم علی ید العبد المذنب

سان گمان بھی نہ تھا۔

یہ بات تو علی العموم سب کو معلوم ہی ہے کہ غالب نے اپنے چند سخن فہم احباب کے مشورہ سے اپنے اشعار کا ایک بڑا حصہ مشکل اور مغلق ہونے کی بنا پر قلمزد کر دیا تھا اور موجودہ مطبوعہ دیوان کی یہ سربریدہ غزلیں اسی ضخیم دیوان کی بچی کھچی نشانیاں ہیں جو ابنائے زمانہ کی آسان پسندی سے شائع ہونے سے پہلے ضائع ہو گیا چنانچہ آزاد مرحوم آبحیات میں لکھتے ہیں :- کہ

"سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دیوان بہت بڑا تھا یہ منتخب ہے۔ مولوی فضل حق صاحب اور مرزا خاں عرف مرزا خانی کوتوال شہر مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے انہوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئینگے۔ مرزا نے کہا کہ اتنا کچھ کہہ چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ خیر ہوا سو ہوا انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو مرزا صاحب نے دیوان حوالہ کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا وہ یہی دیوان ہے جو کہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں" (آبحیات صفحہ [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

تا زدیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن ۔۔۔ ایں مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن

کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است ۔۔۔ شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

یوں تو غالب مرحوم کی اس پیشین گوئی کو امتدادِ زمانہ نے بلا کم و کاست حرف
بہ حرف پورا کر دکھایا ہے اور وہی کلام جس کی نسبت ان کے معاصر یہ کہتے تھے کہ

کلام میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے

مگر انکا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اب ادبِ اُردو کا بہترین سرمایہ اور عروسِ نظم کا بیش بہاترین پیرایہ ہے لیکن شاید یہ بات ان کے وہم و قیاس میں بھی نہ گذری ہوگی کہ ایک دن ان کا وہ ابتدائی کلام بھی حلیۂ طبع سے آراستہ ہو کر اربابِ نظر کے سامنے جلوہ پیرا ہو گا جسے انہوں نے اپنے ہمچشموں کی تنگ نظری سے مجبور ہو کر خود ہی نظری کر دیا تھا اور جس کا بظاہر آثار نام و نشان تک باقی نہ رہا تھا۔ مگر زمانہ نے ابقائے اصلح کے اصول کو شعر و سخن میں بھی ثابت کر ہی دیا اور غالب کے انتقال کے پورے پچاس برس بعد اس صحیفے کو نہاں میں نما کیا جو پوری ایک صدی سے گوشۂ خفا میں پڑا تھا اور جس کے وجود کا کسی کو

سرنامہ

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

میں دلی مسرت سے میرزا غالب دہلوی کے دیوان اُردو کا یہ جدید نسخہ ابنائے ملک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اور مجھے اپنی اس سعادت پر فخر ہے کہ اس شہنشاہِ اقلیم سخنوری کے عہدِ شباب کی نازک خیالی اور نکتہ سنجی کے یہ نقش اول جو سو برس سے کنج خمول اور گوشۂ ذہول میں پڑے تھے۔ آج میرے ذریعے سے ملک میں رونما اور جلوہ پیرا ہوتے ہیں۔ اُردو جو بلا اختلاف مذہب و ملت ہم سب کی مشترکہ زبان ہے جس پر ہماری ساری ترقیوں کا انحصار ہے۔ اپنے مجموعۂ ادب میں اس بے بہا اضافے پر جتنا ناز کرے بجا ہے۔ اور اربابِ فہم و نظر جو بلا امتیاز قوم و وطن اس خلاقِ معانی کی نغمہ سرائی اور مضمون آفرینی کے دلدادہ ہیں۔ اِس کی جس قدر قدر کریں۔ زیبا ہے۔ کیونکہ ہمیں کلام نہیں کہ

از تازگی بہ دہر مکرر نمی شود
نقشے کہ کلکِ غالبِ خونیں رقم کشد

محمد حمید اللہ خان۔ بھوپال

PK
2198
G4A17
1922

LIBRARY
NOV
3
197[illegible]

باسمہ تعالیٰ

دیوانِ غالب جدید

المعروف بہ

نسخۂ حمیدیہ

مع مقدمۂ دیوان

فخرِ قوم جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مرحوم بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

بیرسٹر ایٹ لا۔ ڈی۔ جے

مرتبہ

خاکسار ضیاء العلوم مفتی محمد انوار الحق ایم۔ اے منشی فاضل

ڈائرکٹر تعلیمات ریاست بھوپال

بمفید عام پریس آگرہ میں باہتمام محمد قادر علیخان صوفی طبع ہوا

قیمت مجلد [illegible] [illegible] غیر مجلد [illegible]

حسن
۱۳۴۲ھ
۱۹۲۴ء
باسمہ تعالیٰ

دیوانِ غالبِ جدید

المعروف بہ

نسخۂ حمیدیہ

مع مقدمۂ دیوان

فخرِ قوم جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مرحوم بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی
بیرسٹرایٹ لا۔ ڈی۔ جے

مرتبہ
خاکسار ضیاء العلوم مفتی محمد انوار الحق ایم۔ اے منشی فاضل
ڈائرکٹر تعلیمات ریاست بھوپال

مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ میں باہتمام محمد قادر علیخاں صوفی طبع ہوا
قیمت [illegible]
[illegible]

PLEASE DO NOT REMOVE
CARDS OR SLIPS FROM THIS POCKET

UNIVERSITY OF TORONTO LIBRARY

PK 2198 G4A17 1922
Ghalib
Divan-i Ghalib jadid